MUD-010

Special Study of Meer Taqi Meer and Mirza Ghalib

میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اسکول آف ہیومنٹیز

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی

Vol-2

جلد دوم

تعلیم انسان کو بے جا پابندیوں سے آزاد کرتی ہے اور آج کے عہد میں یہ جمہوریت کے احساس کی بنیاد ہے۔ تعلیم نسل اور دیگر حالات سے پنپنے والی ذات، برادری اور دوسری طبقاتی تفریق کو ختم کر کے انسان کو ایسی تمام برائیوں سے اوپر اٹھاتی ہے۔

اندرا گاندھی

"Education is a liberating force, and in our age it is also a democratising force, cutting across the barriers of caste and class, smoothing out inequalities imposed by birth and other circumstances."

- Indira Gandhi

MUD-010

Special Study of Meer Taqi Meer and Mirza Ghalib

میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

جلد دوم

بلاک 4
مرزا غالبؔ: حیات و شخصیت 9

بلاک 5
مرزا غالبؔ: فکر و فن (اول) 103

بلاک 6
مرزا غالبؔ: فکر و فن (دوم) 173

EXPERT COMMITTEE

Professor Malati Mathur
Director, School of Humanities
IGNOU, New Delhi.

Professor Mohammad Faruq Ansari
NCERT, New Delhi.

Professor Mohd. Shahid Husain
Shahjahanabad Apartments
Sector -11, Dwarka, New Delhi

Professor S.M. Anwar Alam
New Delhi. Centre of Indian Languages, JNU,

COURSE COORDINATOR

Dr. Shakir Ali Siddiqui, Assistant Professor, Discipline of Urdu, School of Humanities, IGNOU, New Delhi

Editor: Prof. Wahajuddin Alvi, Former Dean, Faculty of Humanities and Languages & Professor, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi

COURSE PREPARATION

Writers	Units
Prof. Nasera Basri, Head, Department of Urdu and Persian, Rajasthan University, Jaipur, Rajasthan	17
Dr. Irfan Ahmad Malik, Associate Professor, Department of Urdu, Central University of Kashmir, Kashmir, J&K	18, 19 & 22
Dr. Uzair Ahmad, Assistant Professor, Department of Urdu, Islampur College, Uttar Dinajpur, West Bengal	20
Dr. Mohd. Mukeem, Assistant Professor, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi, Delhi	21
Dr. Musheer Ahmad, Assistant Professor, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi, Delhi	23 & 24
Dr. Noor Fatima, Assistant Professor, Department of Urdu, MANUU, Lucknow Campus, Lucknow, UP	25
Prof. Shamshul Hoda, Head, Department of Urdu, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, Telangana	26
Dr. Mohd. Akbar, Assistant Professor, CPDUMT, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, Telangana	27
Dr. Zubair Ahmad Siddiqui, Assistant Professor (Urdu), Distance and Online Education, Aligarh Muslim University, Aligarh, UP	28 & 29
Dr. Shakir Ali Siddiqui, Assistant Professor, Discipline of Urdu, IGNOU, New Delhi, Delhi	30
Dr. Sajid Zaki Fahmi, Assistant Professor, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi, Delhi	31
Prof. Mohd. Moazzamuddin, Department of Education in Language, NCERT, New Delhi, Delhi	32

PRODUCTION
Mr. Tilak Raj
Assistant Registrar (Pub.)
MPDD, IGNOU, New Delhi

June, 2023
© Indira Gandhi National Open University, 2023
ISBN: 978-93-5568-852-1
All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the copyright holder.
Further information on the Indira Gandhi National Open University courses may be obtained from the University's office at Maidan Garhi, New Delhi-110068 or the official website of IGNOU at www.ignou.ac.in
Printed and published on behalf of the Indira Gandhi National Open University by Registrar, MPDD, Maidan Garhi, New Delhi
CRC Prepared by Tessa Media & Computers, C-206, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, N.D.-25
Printed at : Saraswati Offset Printers Pvt. Ltd., Saraswati House, A-5, Naraina Industrial Area, Ph-II, New Delhi-110028

فہرست

بلاک 4 مرزا غالبؔ: حیات و شخصیت 9

اکائی 17 عہد غالبؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال 11

اکائی 18 عہد غالبؔ کا شعری منظر نامہ 27

اکائی 19 غالبؔ کے سوانحی حالات و کوائف 41

اکائی 20 غالبؔ اور پنشن کا قضیہ 55

اکائی 21 غالبؔ کے ادبی معرکے 71

اکائی 22 غالبؔ کے نمائندہ معاصرین 89

بلاک 5 مرزا غالبؔ: فکر و فن (اول) 103

اکائی 23 غالبؔ کی خطوط نگاری کا تنقیدی جائزہ 105

اکائی 24 غالبؔ کے منتخب خطوط کی تدریس و تفہیم 119

اکائی 25 غالبؔ کی اردو اور فارسی نثری تصانیف کا تعارف 137

اکائی 26 جدید اردو نثر اور غالبؔ کا اسلوب نگارش 157

بلاک 6 مرزا غالبؔ: فکر و فن (دوم) 173

اکائی 27 غالبؔ کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ 175

اکائی 28 غالبؔ کے منتخب قصیدوں کی تدریس و تفہیم 189

اکائی 29 غالبؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ 223

اکائی 30 غالبؔ: ردیف ''الف'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم 239

اکائی 31 غالبؔ: ردیف ''ن'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم 261

اکائی 32 غالبؔ: ردیف ''ی'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم 283

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

کورس کا تعارف

فاصلاتی نظام تعلیم اس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ نظام تعلیم درس وتدریس کی راہیں ہموار کر کے طلبا کو گھر بیٹھے با آسانی تعلیم مہیا کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہ نظام تعلیم قریب کے طلبا کے ساتھ ساتھ دور دراز طلبا کو بھی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کا یکساں موقع فراہم کرتا ہے۔ اس میں نہ تو کسی عمر کی پابندی اور نہ ہی باقاعدہ کلاس کی ضرورت ہوتی ہے۔ لرنرز (سیکھنے والے) اپنی مشغولات اور مصروفیت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ فاصلاتی نظام تعلیم میں سیلف لرننگ میٹریل (SLM) کے توسط سے طلبا کی نصابی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایس۔ ایل۔ ایم کو تیار کرنے میں متعدد بنیادی باتوں کا خیال رکھنا اشد ضروری ہوتا ہے، مثلاً طلبا کو دوران مطالعہ استاد کی موجودگی کا احساس دلانا۔ مرکب جملوں کے بجائے مفرد جملوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا۔ عام فہم اور بامحاورہ زبان کا التزام کرنا۔ اکائی میں متعلقہ موضوع کی معلومات کو زیادہ سے زیادہ یکجا کرنا۔ عملی مشق کے مواقع فراہم کرنا۔ ''اغراض ومقاصد''، ''تمہید''، ''اصل موضوع''، ''آپ نے کیا سیکھا؟''، ''اپنا امتحان خود لیجیے''، ''سوالوں کے جوابات''، ''فرہنگ'' اور ''کتب برائے مطالعہ'' کے ذریعے اکائی کو دلچسپ اور موثر بنانے کی حتی المقدور کوشش کرنا وغیرہ، تاکہ ایس۔ ایل۔ ایم کی ساخت اور اسلوب از خود طلبا کی رہنمائی کر سکے۔ اگنو کی ترجیحات میں ہے کہ عام فہم اور بامحارہ زبان میں عمدہ اور معتبر مواد پر مبنی ("SLM" Self Learning Material) تیار کیا جائے تاکہ ہر سطح اور ہر عمر کے لوگ مطالعہ کر کے اسے با آسانی سمجھ سکیں۔

''میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ'' کا کورس ایم ا۔ اے اردو کے فاصلاتی نظام تعلیم سے منسلک طلبا کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ یہ کورس مجموعی ۸ کریڈٹ پر مشتمل ہے، جسے دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، جلد اول ''میر تقی میرؔ کا خصوصی مطالعہ'' کے نام سے معنون ہے، جس میں تین بلاک پر مبنی سولہ (۱۶) اکائیاں شامل ہیں اور جلد دوم ''مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ'' کو مختص ہے، اس میں بھی تین بلاک پر مشتمل سولہ (۱۶) اکائیاں شامل ہیں، اس طرح یہ مکمل کورس چھ (۶) بلاک پر مبنی بتیس (۳۲) اکائیوں کو محیط ہے۔

خصوصی مطالعہ طلبا کو شخصیت کی ہمہ جہتی سے متعارف کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ اس میں طلبا کو مخصوص موضوع کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ اور دسترس حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک طرح سے خصوصی مطالعات طلبا کے لیے تحقیقی راہ ہموار کرنے میں بہت معاون اور ذہنی، علمی اور ادبی آبیاری کا باعث ہوتے ہیں، اس لیے روایتی اور غیر روایتی نظام تعلیم میں خصوصی کورسیز (پرچے) کو فوقیت حاصل ہے۔ زیر نظر کورس بھی خصوصی مطالعے میں شامل ہے۔ اس کورس کی ہر اکائی میں اغراض ومقاصد بیان کیے گئے ہیں تاکہ طلبا میں تجسس اور تحرک کے ساتھ ساتھ مطالعہ کا ذوق وشوق نمو پذیر ہو سکے۔ ''تمہید'' میں اکائی کا مختصر اور مربوط تعارف پیش کیا گیا ہے جس سے طلبا کو اکائی پڑھنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کیا جا سکے۔ طلبا کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے اکائی کے اصل موضوع کو بھی

حسب ضرورت ذیلی عناوین میں منقسم کیا گیا ہے۔ مفہوم کی آسان ترسیل کے لیے اکائی کو سلیس اور عام فہم زبان میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصل موضوع کے مطالعے کے بعد ’’آپ نے کیا سیکھا؟‘‘ کے تحت طلبا کو پوری اکائی اچھی طرح ذہن نشیں کرائی گئی ہے۔ مزید اصل موضوع کے اختتام پر ’’ماحصل‘‘ کی پیشانی لگا کر پورے مطالعہ کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے، تا کہ طلبا باسہولت اکائی کا نچوڑ سمجھ سکیں۔ ’’اپنا امتحان خود لیجیے‘‘ اور ’’سوالوں کے جوابات‘‘ کے عناوین قائم کر کے طلبا کو سرگرم اور متحرک رکھنے کی عملی کوشش کی گئی ہے، جس سے طلبا اپنی صلاحیت کا از خود جائزہ لے سکیں۔ طلبا کی سہولت کے لیے ہر اکائی میں مشکل الفاظ کی ’’فرہنگ‘‘ بھی شامل کی گئی ہے اور تمام اکائیوں کے آخر میں معاون کتابوں کی فہرست درج کی گئی ہے، تا کہ معاون کتابوں کا مطالعہ کر کے طلبا اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔ زیر نظر کتاب ’’مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ‘‘ پر مبنی ہے۔ اس میں بھی تین بلاک کے تحت سولہ (۱۶) اکائیاں شامل نصاب ہیں، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

چوتھے بلاک کا عنوان ’’مرزا غالبؔ: حیات و شخصیت‘‘ ہے۔ اس بلاک کے ضمن میں چھ (۶) اکائیاں (اکائی نمبر ۱۷ تا ۲۲) شامل ہیں۔ سترہویں اکائی میں ’’عہد غالب کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال‘‘ کو بیان کیا گیا ہے تا کہ غالبؔ کے عہد کو سمجھا جا سکے۔ شخصیت کی تشکیل میں عہد کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے، فنکار کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر اپنے عہد کی سیاست، معاشرت اور تہذیب سے متاثر ہوتا ہے۔ جس کے واضح اثرات فن پارے پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا عہد کو سمجھے بغیر اگر فن کار اور فن پارے کو سمجھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اٹھارویں اکائی ’’عہد غالب کا شعری منظر نامہ‘‘ ہے، جس میں اس وقت کے شعری افکار و نظریات اور تجربات اور غالب رجحانات کو اس وقت کے اہم شعرا کے حوالے سے زیر بحث لایا گیا ہے، یہ اکائی عہد غالب کے شعری منظر نامے کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔ انیسویں اکائی ’’غالب کے سوانحی حالات و کوائف‘‘ کو مختص ہے، جس میں ان کی سیرت و شخصیت کے اہم پہلوؤں مثلاً: آبا و اجداد، پرورش و پرداخت، تعلیم و تربیت، حالات و واقعات وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ بیسویں اکائی ’’غالب اور پنشن کا قضیہ‘‘ پر محمول ہے، جس میں پنشن کے پس منظر، غالب کے اعتراضات، سفری روداد، مقدمہ کی پیروی، مراحل اور نتائج پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ غالب کی زندگی کا یہ ایک بڑا قضیہ تھا، جس کے تدارک کے لیے غالب نے انتھک کوشش کی اور اس کوشش میں ان کے ساتھ جو مسائل اور واقعات در پیش آئے وہ غالب کی شخصیت اور نظریات کو سمجھنے کا وسیلہ ہیں۔ اکیسویں اکائی ’’غالب کے ادبی معرکے‘‘ سے عبارت ہے، اس میں غالب کی زندگی میں پیش آنے والے ادبی معرکوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان معرکوں کا مطالعہ یوں سود مند ہے کہ اس سے طلبا کو غالب کی علمی و ادبی دسترس اور فکری وسعتوں کا صحیح علم حاصل ہوگا۔ بائیسویں اکائی میں غالب کے نمائندہ معاصرین کی حیات و شخصیت، افکار و نظریات، کلام کے امتیازات اور نمونہ کلام وغیرہ سے گفتگو کی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ بلاک غالب کے عہد اور ان کی سیرت و شخصیت اور اس وقت کے شعری رجحان کو سمجھنے میں نہایت کار آمد ہے۔

پانچواں بلاک ’’غالب: فکروفن (اول)‘‘ ہے۔ اس بلاک میں چار (۴) اکائیاں (اکائی نمبر ۲۳ تا ۲۶) شامل ہیں۔ یہ چاروں اکائیاں غالب کی نثری خدمات کا احاطہ کرتی ہیں۔ تیئسویں اکائی ’’غالب کی خطوط نگاری کا تنقیدی جائزہ‘‘ کے نام سے مخصوص کی گئی ہے، جس میں غالب کی خطوط نگاری کی خصوصیات، امتیازات اور موضوعات کو موضوع بحث بنا کر انفرادیت، اہمیت اور معنویت کو واضح کیا گیا ہے۔ چوبیسویں اکائی میں ’’غالب کے منتخب خطوط کی تدریس وتفہیم‘‘ کے عنوان سے مختلف النوع موضوعات پر مبنی پانچ خطوں کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ پہلا خط لسانی مباحث، دوسرا خط تاریخی حادثات وواقعات، تیسرا خط تہذیب ومعاشرت، چوتھا خط ’’طنزیہ ومزاحیہ اور پانچواں خط مکالماتی انداز گفتگو پر مبنی ہے۔ اکائی میں پانچوں خطوط کے متن اور ان کی تشریحات کو شامل کیا گیا ہے تاکہ طلبا ان کے خطوط کی عظمت اور قدر وقیمت کو بہ خوبی سمجھ سکیں۔ پچیسویں اکائی ’’غالب کی اردو اور فارسی نثری تصانیف کا تعارف‘‘ کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔ جس میں غالب کی اردو اور فاسی کی تمام نثری خدمات مثلاً: عود ہندی، اردوے معلیٰ، پنج آہنگ، مہر نیم روز، دستنبو، قاطع برہان، لطائف غیبی، سوالات عبد الکریم، نامۂ غالب اور تیغ تیز وغیرہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چھبیسویں اکائی ’’جدید اردو نثر اور غالب کا اسلوب نگارش‘‘ ہے۔ چوں کہ غالب کا شمار جدید اردو نثر کے بانیان میں ہوتا ہے، اس لیے اس اکائی میں جدید اردو نثر کی روشنی میں غالب کے اسلوب نگارش کا جائزہ لے کر ان کے اسلوب نگارش کی انفرادیت اور اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

چھٹا بلاک ’’غالب: فکروفن (دوم)‘‘ کے نام سے معنون ہے۔ اس بلاک کے ضمن میں چھ (۶) کائیاں (اکائی نمبر ۲۷ تا ۳۲) مختص کی گئی ہیں۔ ستائیسویں اکائی ’’غالب کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ‘‘ پر مشتمل ہے۔ اس اکائی میں اجزائے ترکیبی کی روشنی میں غالب کے قصیدوں کی خصوصیات، امتیازات اور فکروفن سے بحث کی گئی ہے۔ غالب کے نمائندہ تمام قصائد کی روشنی میں ان کے انفرادی پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ غالب کی قصیدہ نگاری کو سمجھنے میں طلبا کے لیے یہ یونٹ بے حد معاون ہے۔ اٹھائیسویں اکائی ’’غالب کے منتخب قصیدوں کی تدریس وتفہیم‘‘ کے لیے خاص کی گئی ہے، جس میں غالب کے دو قصیدے ’’دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں‘‘ اور ’’ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام‘‘ کے متن کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ اول متن کی قرأت اور دوم متن کی عام فہم تشریحات کے ذریعے عملی طور پر طلبا کے لیے قصیدوں کو سمجھنے کی راہیں ہموار کی گئی ہیں، مزید دوران تشریح اشعار کے محاسن کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس طریق کار سے طلبا میں متن فہمی کا شعور پیدا ہوگا۔ انتیسویں اکائی ’’غالب کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ‘‘ پر مبنی ہے، جس میں غالب کی غزلوں کے فکروفن کو اشعار کی پیش کش سے مبرہن کیا گیا ہے۔ اس اکائی میں خاص توجہ صرف کی گئی ہے کہ غالب کی غزل گوئی کی تمام خصوصیات و امتیازات یکجا ہو جائیں تاکہ طلبا اس اکائی کو پڑھ کر غالب کی غزل گوئی کے اہم خدوخال، طرز اظہار اور نظام شعر کا ادراک کر سکیں۔ اس بلاک کی آخری تین اکائیوں میں غزلوں کے متن کو شامل کیا گیا ہے۔ تیسویں اکائی میں

ردیف ’الف‘ کی پانچ غزلیں، اکتیسویں اکائی میں ردیف ’ن‘ کی پانچ غزلیں اور بتیسویں اکائی میں ردیف ’ی‘ کی پانچ غزلیں منتخب کی گئی ہیں، اس طرح کل پندرہ غزلیں شامل نصاب ہیں۔ ان غزلوں کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ غالب کے تمام دور اور رنگ کی غزلیں شامل نصاب ہوں تا کہ طلبا غالب کے ذہن و مزاج کے ارتقا کو سمجھ سکیں۔ ہر اکائی میں متن کی قرأت اور اس کی تشریح و توضیح کو عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی اور حسب ضرورت اشعار کے مشکل الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی دونوں معنی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شعری محاسن کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس طرح یہ بلاک غالب کی دو اصناف قصیدہ اور غزل کی بحث سے عبارت ہے۔

MUD-010

Special Study of Meer Taqi Meer and Mirza Ghalib

میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

4

مرزا غالبؔ: حیات و شخصیت

بلاک 4 کا تعارف

اکائی 17
عہد غالبؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال 11

اکائی 18
عہد غالبؔ کا شعری منظر نامہ 27

اکائی 19
غالبؔ کے سوانحی حالات و کوائف 41

اکائی 20
غالبؔ اور پنشن کا قضیہ 55

اکائی 21
غالبؔ کے ادبی معرکے 71

اکائی 22
غالبؔ کے نمائندہ معاصرین 89

بلاک 4 تعارف

چوتھے بلاک کا عنوان ''مرزا غالبؔ: حیات وشخصیت'' ہے۔ اس بلاک کے ضمن میں چھ (۶) اکائیاں (اکائی نمبر ۱۷ تا ۲۲) شامل ہیں۔ سترہویں اکائی میں ''عہد غالب کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال'' کو بیان کیا گیا ہے تاکہ غالبؔ کے عہد کو سمجھا جاسکے۔ شخصیت کی تشکیل میں عہد کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے، فنکار کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر اپنے عہد کی سیاست، معاشرت اور تہذیب سے متاثر ہوتا ہے۔ جس کے واضح اثرات فن پارے پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا عہد کو سمجھے بغیر اگر فن کار اور فن پارے کو سمجھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اٹھارویں اکائی ''عہد غالب کا شعری منظر نامہ'' ہے، جس میں اس وقت کے شعری افکار ونظریات اور تجربات اور غالب رجحانات کو اس وقت کے اہم شعرا کے حوالے سے زیر بحث لایا گیا ہے، یہ اکائی عہد غالب کے شعری منظر نامے کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔ انیسویں اکائی ''غالب کے سوانحی حالات وکوائف'' کو مختص ہے، جس میں ان کی سیرت وشخصیت کے اہم پہلوؤں مثلاً: آباواجداد، پرورش وپرداخت، تعلیم وتربیت، حالات وواقعات وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ بیسویں اکائی ''غالب اور پنشن کا قضیہ'' پر محمول ہے، جس میں پنشن کے پس منظر، غالب کے اعتراضات، سفری روداد، مقدمہ کی پیروی، مراحل اور نتائج پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ غالب کی زندگی کا یہ ایک بڑا قضیہ تھا، جس کے تدارک کے لیے غالب نے انتھک کوشش کی اور اس کوشش میں ان کے ساتھ جو مسائل اور واقعات درپیش آئے وہ غالب کی شخصیت اور نظریات کو سمجھنے کا وسیلہ ہیں۔ اکیسویں اکائی ''غالب کے ادبی معرکے'' سے عبارت ہے، اس میں غالب کی زندگی میں پیش آنے والے ادبی معرکوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان معرکوں کا مطالعہ یوں سودمند ہے کہ اس سے طلبا کو غالب کی علمی وادبی دسترس اور فکری وسعتوں کا صحیح علم حاصل ہوگا۔ بائیسویں اکائی میں غالب کے نمائندہ معاصرین کی حیات وشخصیت، افکار ونظریات، کلام کے امتیازات اور نمونہ کلام وغیرہ سے گفتگو کی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ بلاک غالب کے عہد اور ان کی سیرت وشخصیت اور اس وقت کے شعری رجحان کو سمجھنے میں نہایت کارآمد ہے۔

اکائی 17 عہدِ غالبؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال

ساخت

17.1 اغراض و مقاصد
17.2 تمہید
17.3 عہدِ غالبؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال
  17.3.1 عہدِ غالبؔ کی سیاسی صورتِ حال
  17.3.2 عہدِ غالبؔ کی سماجی صورتِ حال
  17.3.3 عہدِ غالبؔ کی تہذیبی صورتِ حال
  17.3.4 ماحصل
17.4 آپ نے کیا سیکھا؟
17.5 اپنا امتحان خود لیجیے
17.6 سوالوں کے جوابات
17.7 فرہنگ
17.8 کتب برائے مطالعہ

17.1 اغراض و مقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- عہدِ غالبؔ کی سیاسی صورت حال سے واقف ہوں گے۔
- عہدِ غالبؔ کی سماجی صورت حال سے متعارف ہوں گے۔
- عہدِ غالبؔ کی تہذیبی صورت حال سے روشناس ہوں گے۔
- عہدِ غالبؔ کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کے اسباب و علل سے آگاہ ہوں گے۔
- عہدِ غالبؔ کی اہمیت، افادیت اور معنویت سے باخبر ہوں گے۔

17.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائیوں میں آپ نے میر تقی میرؔ کا مختلف جہتوں سے خصوصی مطالعہ کیا۔ اب آپ اپنے کورس

کے دوسرے حصے میں مرزا غالب کا مختلف حوالوں سے خصوصی مطالعہ کریں گے۔ اس مطالعہ میں سب سے پہلے آپ عہد غالب کو جانیں گے تاکہ بہ خوبی علم ہو سکے کہ آیا غالب کے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کیا تھی۔ چوں کہ تخلیق کار کی تخلیقات پر مخصوص عہد کے اثرات شعوری اور غیر شعوری دونوں طور سے مرتب ہوتے ہیں، لہٰذا عہد غالب کو سمجھے بغیر غالب کے متن کو سمجھنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ غالبؔ دنیائے اردو کے ہی نہیں بلکہ دنیا کی دیگر زبانوں کے عظیم شاعروں میں سے ایک تھے۔ وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ بلند پایہ نثار بھی تھے، ان کے کلام اور خطوط خود ہی ان کے عہد کی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی صورتِ حال کو جاننے میں معاون ہیں۔ لہٰذا اس سبق میں آپ عہد غالب کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کا تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

17.3 عہدِ غالبؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال

17.3.1 عہد غالبؔ کی سیاسی صورتِ حال

سترھویں صدی میں مغلیہ سلطنت اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ جس میں بنیادی کردار اورنگ زیب عالمگیر کا تھا۔ انہوں نے برصغیر کو نہ صرف سیاسی اتحاد سے روشناس کرایا تھا بلکہ وسیع تہذیبی ہم آہنگی پیدا کر کے اس کو مضبوط ثقافتی ڈھانچہ بھی فراہم کیا تھا۔ اورنگ زیب کے دور میں معاشرے کی تخلیقی وفکری صلاحیتیں اچھی طرح پھل پھول رہی تھیں، کیوں کہ انہیں کی کاوش سے ملک میں بہت مدت کے بعد سیاسی اتحاد قائم ہوا تھا۔ شمال وجنوب کے باہم ملنے سے لوگ آپسی تبادلۂ خیالات میں ہم آہنگی محسوس کر رہے تھے اور سیاسی انتشار سے چھٹکارے کے سبب وہ دوسری صلاحیتوں کی طرف بھی توجہ دینے لگے تھے۔ لہٰذا یہ صلاحیتیں اپنے بہار کی جوبن پر پہنچ گئیں۔ ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت نے زوال پذیری کی طرف اپنا رختِ سفر باندھا۔ ان کے جانشینوں نے عالی ہمتی کے بجائے پست ہمتی، بصیرت کے بجائے لالچ سے کام لے کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ حالات ہر طرف دگرگوں ہوتے جا رہے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان کا بڑا بیٹا معظم شاہ بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشیں ہوا۔ وہ چار سال بعد ۱۷۱۲ء میں وفات پا گیا۔ ان کے بیٹوں میں تخت شاہی کے حصول کے لیے خانہ جنگی شروع ہوگئی، جو مغلیہ سلطنت کے مکمل زوال کا سبب بنا۔ تختِ شاہی کے حصول کی جنگ میں جہاندار شاہ نے بازی لی اور سلطنت کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ لیکن ان کے ساتھ مسئلہ تھا کہ وہ افیم کا عادی اور شراب کی لت میں گرفتار تھا اور رات دن لال کنور کے عشق میں مست رہتا تھا۔ جنسی اطوار میں ملوث رہتا تھا۔ جہاندار شاہ نے اپنی عیش پرستی اور لال کنور کے عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ سے فرخ سیر سے شکست کھائی اور اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا۔ ان کے بعد سادات بارہہ کی مدد سے

فرخ سیر تخت شاہی پر بیٹھا۔ ۱۷۱۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لیے اپنی سفارت بھیجی جس میں ہیملٹن بھی شامل تھے۔ انہوں نے بادشاہ کا علاج کیا تھا اس لیے بادشاہ نے بہ خوشی ان کو مراعات دے دیں۔ فرخ سیر نے ساداتِ بارہہ کے شکنجے سے نجات پانے کے لیے اپنا گروہ تیار کیا، جس سے شاہی دربار سازشوں اور دغا بازوں کا اڈہ بن گیا۔ آخر میں فرخ سیر کو بھی اندھا کیا گیا اور بے دردی کی موت مارا گیا۔ ساداتِ بارہہ نے پہلے رفیع الدرجات اور پھر روشن اختر کو محمد شاہ کا لقب دے کر تخت پر بٹھایا، مگر سب ناکارہ ہی ثابت ہوئے۔

محمد شاہ رنگیلا اورنگ زیب کے بعد طویل مدت تک تخت پر بیٹھا۔ لیکن وہ بھی سابقہ بادشاہوں کی طرح بزدل، عیش پرست اور کاہل تھا۔ اس نے بھی افیون کھا کھا کر اپنی صحت خراب کر لی تھی۔ مرہٹے، سکھ، روہیلے اور جاٹوں نے اپنی شورشوں سے سلطنت کے در و دیوار ہلا دیے تھے۔ ایرانی، تورانی آویزش کا فائدہ یہی مرہٹے، سکھ، روہیلے، جاٹ اور دوسری اقوام اٹھا رہی تھیں، جس سے ہر طرف سیاسی پراگندگی پھیل گئی۔ نظام الملک آصف جاہ، تورانی گروہ کا لیڈر اور وزیر الممالک تھا اور امیر خان، میر اسحاق انجام اور اسحاق خان نجم الدولہ ایرانی جماعت کی پیشوائی کر رہے تھے۔ نظام الملک اپنے مخالفین کا مقابلہ کرنے سے بے بس و مجبور ہو کر نادر شاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی، یوں اس نے ۱۷۳۹ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ بادشاہ کی طرف سے کمک نہ پہنچنے پر ناظمِ لاہور نے ہتھیار ڈال دیے اور نادر شاہ نے لاہور فتح کیا۔ اس خبر کو پا کر محمد شاہ اپنی فوج لے کر کرنال روانہ ہوا لیکن شکست سے دوچار ہوا۔ بعد میں امرا کی بدولت صلح ہو گئی لیکن ایک دن جب نادر شاہ کے قتل کی افواہ اڑ گئی تو شہر کے کچھ لوگوں نے ایرانی فوجیوں پر حملہ کیا جس میں تقریباً سات سو کے قریب فوجی مارے گئے۔ جب نادر شاہ نے یہ خبر سنی تو انہوں نے دہلی کی غارت گری اور قتلِ عام کا حکم صادر کیا۔ جس میں ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب افراد کو قتل کیا گیا۔ ان حالات سے سیاسی طور پر دہلی مفلوج ہو کر رہ گئی اور اقتصادی طور پر بہت بڑا دھچکا لگا۔

شاہ عالم ثانی عالمگیر ثانی کا بیٹا تھا۔ یہ ۱۷۲۸ء میں محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں پیدا ہوا۔ عماد الملک نے اس کے باپ کو عالمگیر ثانی کے لقب سے ۱۷۵۴ء بادشاہ بنایا، لیکن اس کی حیثیت بھی شطرنج کے بادشاہ سے زیادہ نہ تھی۔ آخر کار عماد الملک نے عالمگیر ثانی کا قتل کرا دیا۔ ولی عہد شاہ عالم ثانی کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے ۱۷۵۹ء موضع کھتولی صوبہ بہار میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ نجیب الدولہ کو امیر الامرا اور شجاع الدولہ کو اپنا وزیر بنا لیا۔ ۱۷۶۱ء میں شجاع الدولہ نے شاہ عالم ثانی کو اپنی حمایت میں لے لیا اور ۱۷۶۴ء میں میر قاسم، شجاع الدولہ اور شاہ عالم ثانی تینوں نے مل کر بہار پر حملہ کیا، لیکن بکسر کی جنگ میں ناکامی ہاتھ لگی۔ ۱۷۶۴ء میں انگریزوں سے بکسر کی جنگ ہارنے کے بعد مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی برائے نام بادشاہ بن کر رہ گیا۔ انگریز جواب تک ملک میں

بظاہر تجارت کر رہے تھے کھل کر حکومت کرنے لگے۔ ۱۷۶۵ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ تینوں صوبوں کے دیوانی حقوق شاہ عالم ثانی نے مجبور ہوکر انگریزوں کے سپرد کر دیے۔ جس کے معاوضے میں انگریزوں نے ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ پنشن مقرر کردی۔ نجیب الدولہ کی وفات کے بعد ۱۷۷۱ء میں مرہٹوں نے دلی پر قبضہ کرلیا اور پورے ملک کو اپنے زیرنگیں لانے کی خاطر شاہ عالم ثانی کو ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء میں مرہٹوں نے دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس طرح شاہ عالم ثانی انگریزوں کی غلامی سے باہر نکل کر مرہٹوں کا غلام بن گیا۔ جنوری ۱۷۷۲ء میں اس نے مرہٹوں کو خوش کرنے کے لیے مسلمانون کا خون بہایا اور مسلم عورتوں کی بے حرمتی اور آبرو ریزی کا کھیل کھیلا۔ بالآخر غلام قادر خاں نے بطور بدلہ شاہ عالم ثانی کی دونوں آنکھیں نکال کر اسے اندھا کر دیا۔ مرہٹوں کے ہاتھوں ۱۷۸۸ء میں قادر خاں شکست کھا کر قتل ہوگیا، تو پھر دوبارہ شاہ عالم ثانی کو تخت شاہی پر بٹھایا گیا۔

بادشاہ شاہ عالم برائے نام بادشاہ رہا، دکن میں نظام ابتدا ہی سے انگریزوں کی سرپرستی میں آ گیا تھا۔ اب جو کسر رہ گئی تھی وہ ابن الوقت، ہوس پرور لوگوں نے پوری کردی۔ انہوں نے اقتدار کی لالچ میں سلطنت کو خانہ جنگیوں میں جھونک کر ہر طرف سازشوں کا جال بچھا دیا تھا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی فتح کر لی اور شاہ عالم ثانی کو قلعہ معلیٰ کی چہار دیواری تک محدود کر دیا گیا۔ اسی بے چارگی اور غلامی کی حالت میں شاہ عالم ثانی کا ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء کو انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کا بیٹا اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ لیکن یہ بھی بے بسی و بے کسی کی زندگی گزار کر نام کا بادشاہ بنا رہا۔ اکبر شاہ ثانی کے مرنے کے بعد ۱۷ اکتوبر ۱۸۳۷ء میں ان کے بیٹے سراج الدین بہادر شاہ ثانی کے لقب سے تخت شاہی پر بٹھائے گئے۔ یہ بہت دور اندیش تھے، یہ جانتے تھے کہ میری حیثیت تخت شاہی پر محض ایک ڈرامائی کردار کی طرح ہے۔ لیکن وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا انھوں نے شعر و شاعری کو اپنا مشغلہ بنالیا۔ انھوں نے پیشین گوئی کی کہ:

اے ظفؔر بس ہے تجھی تک اہتمام سلطنت
بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نام سلطنت

۱۸۵۷ء میں ان کی یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔

مذکورہ سیاسی اتھل پتھل کے باعث دہلی کے عوام جان و مال کی حفاظت کے لیے دربدر بھٹکنے لگے تھے۔ زندگی وبالِ جان بن گئی تھی، ایسے حالات میں بہت سے اصحاب شعروسخن ترکِ وطن پر مجبور تھے۔ عملی طور پر دہلی پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ مگر ہندوستان کی مقامی طاقتوں کی لوٹ مار سے دہلی کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ اسی دوران انگریز دہلی کے علاوہ دوسرے علاقوں میں اپنے ہاتھ پیر پھیلاتے رہے، بنگال پر قبضہ پہلے ہی جمالیا تھا، دکن کو ماتحت بنا دیا گیا تھا، انگریزی سرمایہ داروں نے ملک کو خوب لوٹا، انگریزوں کی غلامی سے نجات

پانے کے لیے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑی گئی، ۱۸۵۷ء میں جگہ جگہ بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے، لیکن انگریزوں نے ہندوستانیوں کو شکست دی، غدر میں کامیاب ہونے پر انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کو قتل کر دیا اور بہادر شاہ ظفر کو رنگون میں قید کر دیا اور وہیں پر ۷ نومبر ۱۸۶۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں سیاسی افراتفری اور قومی انتشار اپنے عروج پر تھا۔ اس وقت کے سیاسی حالات کو سمجھنے میں غالب کے خطوط بہت معاون ہیں، خاص طور پر ایامِ غدر اور اس کے بعد کے چشم دید حالات خطوط میں بیان ہوئے ہیں۔ الغرض یہ کہ ۱۸۰۳ء سے ۱۸۵۷ء کے بیچ کا دور اتھل پتھل کا دور تھا، ایک طرف مغل سلطنت کا زوال تھا تو دوسری طرف ایک نئی حکومت کا عروج ہو رہا تھا۔ غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اپنے ہاتھ لے لی۔

17.3.2 عہدِ غالب کی سماجی صورتِ حال

سماج اور تہذیب ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ ان دونوں کا آپس میں گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ سماج کو اس کی تہذیب سے ہی جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ دراصل سماج کی طرز زندگی، رہن سہن، طور طریقے، نشست و برخاست ہی تہذیب بن جاتی ہے۔ اسی طرح مطالعۂ سماجیات میں ماحول کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ہر فرد بشر اپنی حیات و ممات تک سماج سے منسلک رہتا ہے۔ سماج انسان کے طور طریقے، عادات و اطوار، رسوم و رواج حکومتوں اور طبقۂ اشرافیہ کے اثرات سے مرتب ہوتا ہے، اسی لیے اس میں تغیر پذیری لازماً ہوتی ہے۔ لیکن سماجی تغیرات کا عمل صدیوں کو محیط ہوتا ہے، یہ من و عن نہیں بدلتا بلکہ رفتہ رفتہ اثر انداز ہوتا ہے۔ مثلاً مغلیہ سلطنت کے نقوش آج بھی سماج میں موجود ہیں، لیکن ان پر مغربی اثرات اس قدر حاوی ہیں کہ اس کی شناخت ثانویت کا درجہ رکھتی ہے۔ عہدِ غالب میں انگریزوں کے زیرِ اثر لوگوں کے رہن سہن، باہمی تعلقات، ایک دوسرے کی خوشی و غم، لباس پوشاک وغیرہ میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ دہلی کے معاشی اور سیاسی حالات بگڑنے کی وجہ سے اس دور کی سماجی زندگی بھی بدل چکی تھی۔

غالب کے زمانے میں دہلی کا لال قلعہ، جامع مسجد، اور چاندنی چوک دہلی والوں کی سماجی زندگی کا حصے تھے، جہاں لوگ ایک دوسرے سے ملتے، شاہی بازار اور دربار لگتے، پھول والوں کا میلا ہوتا وغیرہ۔ دہلی میں ہر ہفتے جمنا کے پل پر لوگ سیر کو جاتے تھے، جامع مسجد کے گرد ہر ہفتے بازار لگتا تھا، پھول والوں کا ہر سال میلا ہوتا تھا۔ قصیدے کہنا، محفلیں جمنا، مشاعرے ہونا، یہ سب اس وقت کے شوق ہوا کرتے تھے۔ لوگ اپنے گھروں میں کتب خانے بنوالیا کرتے تھے، لوگوں کے پاس کتابوں کے ذخیرے تھے۔ شاعری اور موسیقی کی ہر جگہ محفلیں گرم رہتی تھیں۔ امرا، روسا کا تو پوچھنا کیا ہر دولت مند آدمی کے یہاں باقاعدہ مشاعرے اور مجرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ عام و خاص سبھی شاعری اور لطف اندوزی کے ساز و سامان میں منہمک رہتے تھے۔ لال قلعے میں تمام شہزادے شاعری

اور موسیقی میں ہمہ تن گوش رہتے تھے۔ شعر و سخن دہلی کے سماجی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ اس زمانے کی عوام اپنا زیادہ وقت کھیل تماشوں میں گزارتی تھی۔ دہلی کی جامع مسجد کے حوض کے چاروں جانب بازار کی رونقیں تھیں، ان بازاروں میں بٹیر، تیتر، کبوتر اور مرغ وغیرہ فروخت ہوا کرتے تھے۔ کیوں کہ اس وقت کبوتر بازی، مرغ بازی اور پتنگ بازی سماج کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ جامع مسجد، جمنا کا پل، پھول والوں کی گلی، بارش مکان، بلی ماروں کا محلّہ وغیرہ سیر و تفریح اور وقت گزاری کے مراکز تھے۔

غالب کا عہد عیش اور توہم پرستانہ ماحول کا آئینہ دار تھا۔ زیادہ تر لوگ رسموں میں گرفتار تھے۔ اس وقت کی زیادہ تر عوام جاہل پیروں اور شعبدہ بازوں، تعویز اور گنڈوں پر یقین رکھتی تھی۔ بزرگان کی مزاروں پر ہر روز قوالیوں کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھی جس میں عوام بڑی جوش و خروش سے شرکت کرتی تھی۔ رسوم و روایات کی پاس داری کا غلبہ عوام کے ذہنوں پر اس قدر غالب تھا کہ دوا علاج سے زیادہ گنڈے اور تعویزوں، عملیات پر اعتقاد رکھتے تھے۔

ہندوستان میں تہذیبی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی قدروں میں انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی منظر نامے پر غیر معمولی رد و بدل کے آثار نظر آ رہے تھے۔ مغلیہ سلطنت کا سورج ٹمٹما رہا تھا اور جاگیردارانہ نظام اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان کی سیاسی قیادت کی باگ دوڑ انگریزی سامراج اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ رہے تھے۔ انگریزی سامراج نے ہندوستان کے سیاسی خد و خال پر اپنے مکرو سائے پھیلا دیے تھے۔ ایک تہذیب پر عالم نزع کی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور دوسری تہذیب کی رگوں میں زندگی کا خون تازہ دم تھا۔ انتشار و اضطراب کے اس دور میں ادبی اور علمی منابع سوکھ چکے تھے۔ سیاسی نظام یقیناً پژمردہ ہو چکا تھا۔ دلّی کے سماجی حالات بد تر تھے، سارا نظم و نسق انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ جو وہ چاہتے وہ ہوتا تھا، راستہ بڑا کروانے، دوکانیں ڈھا دینے گویا ساری دلی میں توڑ پھوڑ کا کام چل رہا تھا، جس کی وضاحت مرزا غالب کے اس خط سے ہوتی ہے:

> ’لو سنو اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں، چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا تھا، بلی ماروں کے دروازے کے پاس کی کئی دوکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا گیا۔‘‘

مرزا غالبؔ کے خطوط اپنے عہد کے مختلف النوع سماجی حالات و واقعات کے عکاس ہیں۔ گویا ان کے خطوط سماجی صورت حال کا نہایت بیش قیمتی دستاویز ہیں، جن سے غالبؔ کے عہد کی سماجی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ عہد غالب میں تہذیبی اعتبار سے روایت سازی کے بجائے روایت شکنی کا عمل زیادہ شدت سے تھا۔ اس زمانے میں ہر طرح کی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی تھیں خواہ وہ سیاسی، سماجی، تعلیمی یا معاشی حالات ہوں سبھی میں تغیر پذیری تھی۔

جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا، ویسے ویسے تبدیلیاں اور تیز ہوتی گئیں۔ سب کی نظروں کے سامنے نوآبادیاتی نظام ابھرتا جارہا تھا۔ نوآبادیاتی نظام کا طریق کار زیادہ طاقت ور، کارگر اور موثر تھا، اس لیے دو نظام زندگی کی کشمکش سے عوام دوچار تھی۔ بقول نثار احمد فاروقی:

> ’’غالبؔ کا عہد یعنی ۱۷۹۷ء سے ۱۸۶۹ء تک پھیلی ہوئی ۷۲ سال کی مدت، جس میں انیسویں صدی کا نصف اول گُم ہوگیا ہے، اپنے سماجی عوامل اور تاریخی اثرات کے اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ میں بہت ہی اہم زمانہ ہے اور ہم صرف ہندوستان ہی نہیں، بلکہ پورے کرۂ ارض پر نظر ڈال کر دیکھیں، تو یہ بڑا فیصلہ کُن عہد نظر آتا ہے، یورپ میں صنعتی انقلاب کی تکمیل ہو رہی ہے، انسانیت تاریخ کے دوراہے پر کھڑی ہے، جہاں تقلید اور اجتہاد، عقلیت اور عقیدہ، روایت اور تجدد یا مختصراً کہیے تو قدیم اور جدید کے درمیان ایسا نمایاں فرق اور اتنا شعور انگیز موازنہ نظر آتا ہے، جو انسانی تہذیب کی چند ہزار سالہ تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتا، یہ وہ دور ہے، جس میں تجدید کو انسانی تہذیب کا تکملہ نہیں، بلکہ روایت کے خلاف ایک صف آرائی سمجھا گیا ہے۔‘‘

(تلاش غالبؔ)

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب وتاریخ مکمل طور پر دوراہے پر کھڑی تھی۔ در اصل انیسویں صدی ردوبدل کی صدی تھی۔ علاقائی زبانیں ابھرنے لگی تھیں۔ لوگ علاقائی زبانوں پر زور بھی دینے لگے تھے۔ اس وقت فارسی زبان ہی اہمیت کی حامل تھی۔ اسی زبان کی بدولت سماج میں عزت اور سرکار ودربار میں اعلیٰ مقام ومراتب حاصل ہوا کرتے تھے۔ کیوں کہ اس وقت ہندوستان میں فارسی زبان کو ہی دربار سے لے کر بازار تک مرکزیت حاصل تھی۔ اس لیے یہ زبان ایک ترقی یافتہ اور اشرافیہ طبقے میں مقبول تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا زور مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد ماند پڑنے لگا اور اردو کی طرف لوگوں کی توجہ ہونے لگی تھی۔ فارسی کے اثرات انیسویں صدی سے کم ہونے لگے تھے اور اردو کی سادگی سے سب متاثر ہورہے تھے۔ میرامن، غالب، دہلی کالج اور سرسید احمد خاں سب کے یہاں اردو کی ترقی کے نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں، فورٹ ولیم کالج نے اردو ادب میں صاف سادہ نثر کی شروعات کی، اور ادب کو آگے بڑھانے میں اپنی خدمات کو انجام دیا۔ اس طرح انیسویں صدی ایک نئی صدی تھی۔ اسی صدی میں ہندوستان میں کچھ مفکر اور روشن خیال بھی پیدا ہو چکے تھے۔ جن میں راجہ رام موہن رائے اور سرسید احمد خان بڑے نام ہیں، جنھوں نے اپنے اپنے مذاہب سے وابستہ افراد کو نئی صدی سے آنے والی تازہ ہوا سے مستفید ہونے کا درس دیا۔ انگریزوں کے ذریعے لائی گئی جدید ترقیات اور علوم وفنون سے سماج کی ذہنیت میں تغیرات پیدا ہونے لگے۔ غرض ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی دورِ

حکومت میں تعلیم کا خاصا فروغ ہوا۔ جدید تعلیم نے قوم کی ترقی کی راہیں کھولیں۔ اس تعلیمی ترقی نے ہندوستان کے سماجی حالات کو یکسر مبدل کر دیا۔

17.3.3 عہد غالبؔ کی تہذیبی صورتِ حال

انسان کے افکار و نظریات، جذبات و احساسات، اخلاق و آداب، طریق معاشرت، میلان طبع اس کے ماحول سے بنتے اور سنورتے ہیں۔ تہذیبی روایت کسی تنہا شخص کی میراث نہیں ہوتی، بلکہ سماج کا حصہ ہوتی ہے۔ جب رہن سہن، آداب معاشرت، شادی بیاہ، تقریبات، لباس، پوشاک، زیورات، خورد و نوش اور تعلیم و تربیت کے طور طریقے وغیرہ جب سماج کا مشترکہ حصہ بن جاتے ہیں تو وہ تہذیب کہلاتی ہے۔ بالفاظ دیگر جب فرد بشر آپسی ضرورتوں کے لیے ملتے جلتے ہیں تو وہی سماج بن جاتا ہے۔ معاشرے کے نظم و نسق کو قائم کرنے کے لیے اصول و ضوابط وضع کیے جاتے ہیں تو ایک مہذب اور منظّم معاشرے کا وجود ہوتا ہے اور جب یہی سماج نسل در نسل ایک طویل زمانے تک روایتی خطوط پر زندگی گزارتا ہے تو اسے اس قوم کی تہذیب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی تہذیب و ثقافت قومی شناخت کا باعث ہوتی ہے۔ تہذیب دراصل اجتماعی طور پر زندگی گزارنے کا نام ہے۔ اس طریقۂ زندگی میں رہن سہن، بود و باش، کھانا پینا، شادی بیاہ، مرگ و وفات، کھیتی باڑی، شاعری، مصوری موسیقی اور تعمیرات وغیرہ سبھی کچھ شامل ہوتے ہیں۔ مغلوں کی اپنی مخصوص تہذہب ہے جو صدیوں پرانی ہے۔ ان کی تہذیب کا جلال و جمال اپنی منفرد شناخت کی وجہ سے پورے عالم میں معروف ہے۔ مغلوں کی تہذیب درحقیت ہندایرانی ہے۔ جس کو ہم ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کے نام سے جانتے ہیں۔ بقول محبوب اللہ مجیب:

> ”مغل تہذیب میں تازگی اور توانائی، شگفتگی اور شیرینی، دلربائی اور دل ستانی، ملائمیت اور موسیقیت، دلبری اور قاہری، سنجیدگی اور دیوانگی، پردہ دری و رفوگری اور ارضیت و ماورائیت کا جو حسین امتزاج ہے وہ نہ محض مقبول و محترم ہے، بلکہ لطیف تر اور خوبصورت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی تہذیب کے بہت سارے نقوش مغل تہذیب سے مستعار ہیں۔“

(مغل تہذیب، ص:۳)

عہد غالبؔ کی تہذیب مغل تہذیب تھی۔ اس تہذیب کے رہن سہن اور بود و باس ایک مخصوص طرز زندگی سے عبارت تھے، جس کا بہت تابناک پس منظر تھا۔ اس دور میں فن تعمیر خاص اہمیت کا حامل تھا۔ ان عمارتوں کی خصوصیات اور امتیازات عہد غالب (مغل) کے تہذیبی مذاق و مزاج کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مغل دور کی تعمیرات اپنے مخصوص تہذیب وثقافت اور تمدن سے ہی عبارت ہیں۔ مثلاً محراب دار عمارتوں کی تعمیر اس وقت کی خاص پہچان تھی، زیادہ تر مکانات ومحلات محراب نما بنائے جاتے تھے۔ یہ محرابیں دو طرح سے بنائی جاتی تھیں گھڑنالی محراب اور نوکیلی محراب، لیکن زیادہ تر اس دور میں گھڑنالی محراب کے بجائے ہر چھوٹی بڑی عمارتوں میں نوکیلی محراب کا رواج عام تھا۔ اس دور میں لوگوں کو گنبد نما عمارتیں بنانے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا۔ بالخصوص تعمیرات میں گنبد سازی کی جاتی تھی۔ مغلوں نے تو اپنی بنائی ہوئی عمارتوں میں دو اور دو سے زائد گنبدوں کا التزام کیا ہے۔ اس عہد میں کی گئی تعمیرات میں عام طور پر لال پتھر اور خاص طور پر سنگ مرمر پتھر کا خوب استعمال کیا گیا ہے۔ باغات اور سرائے اس وقت کی تہذیب کا حصہ تھی۔ فن تعمیر کی خصوصیات میں شامل تھا کہ بیشتر عمارتوں میں باغات اور سرائے بنانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اسی طرح باغوں میں ''سرو'' درخت ضرور لگائے جاتے تھے۔ عام مکانوں میں مردان خانہ اور زنان خانہ علاحدہ علاحدہ بنائے جاتے تھے، جن میں کافی فاصلہ ہوا کرتا تھا۔ مکانوں میں عریض ووسیع آنگن رکھنے کا بھی رواج تھا۔ اس وقت نقش ونگار اور جالیوں سے عمارتوں کی تزین کاری کا رجحان بھی عام تھا۔ نقش نگاری پر خوب روپیہ پیسہ صرف کیا جاتا تھا۔ قلعات، محلات، دیوان عام، دیوان خاص، مقبرے، مساجد، حویلیاں، مکانات اور سرائے وغیرہ کی خوب سے خوب نقش نگاری اور جالی دار کام سے تزین کاری کی جاتی تھی، یہی فن تعمیر اس وقت کی عمارتوں کا تہذیبی حصہ تھا۔ اس دور میں عمارتیں زیادہ تر دو منزلہ ہوتی تھیں۔ امرا کی ڈیوڑھیوں میں عموماً نوبت خانے ہوتے تھے، بعض ڈیوڑھیوں میں گڑھیال لگے ہوئے تھے جو ہر تین گھنٹے کے بعد بجائے جاتے تھے، جس سے پہر گذرنے کا اندازہ ہوتا تھا۔ ہر امیر کے ساتھ پیدل اور سوار فوج رہتی تھی۔ امیروں کی ڈیوڑھیوں میں کئی ملازم ہوتے تھے۔ منشی، دیوان، محرر، متصدی، داروغہ، نسقچی، نقیب، برقنداز، چوکی دار، آفتابہ بردار، آبدار، خانساماں، فراش، مہاوت، سائیس، نعل بند، آہن گر، کتاب دار، خوش نویس، عرائض نویس، فوطہ دار، اتالیق وغیرہ۔ اسی طرح حرم میں قلماقنیاں، آیائیں، کھلائیاں، دائیاں، اناٗئیں ہوا کرتی تھیں۔

مغل دور کی مصوری، موسیقی اور شاعری بھی ان کی تہذیب کا اٹوٹ حصہ تھی۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک مصوری اور موسیقی کے جو نقوش ملتے ہیں وہ صرف اور صرف ان کے ذوق جمال کی تسکین نہیں بلکہ ان کی تہذیب بھی تھی۔ شبیہ سازی، تزین کاری کا رواج عام تھا، اس دور میں بڑے بڑے مصور پیدا ہوئے جنھوں نے فطری اور غیر فطری دونوں طرح کے مناظر کی مصوری کی۔ جانوروں، پرندوں اور بالخصوص درباری مناظر کے خوب نقوش تیار ہوئے۔ اسی طرح اس دور میں موسیقی کا بھی دور دورہ تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں ''تان رس'' بہت مشہور موسیقار تھا۔ اس کا ہر طرف طوطی بولتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر خود ''بول'' لکھا کرتے تھے اور ان بولوں کو تان رس لے، تان اور راگ میں ڈھالتا تھا۔ الغرض یہ کہ دربار سے لے کر بازار تک رقص وسرود، سماع، قوالی وغیرہ کی

محفلیں جمتی رہتی تھیں۔ اسی طرح اس دور میں شاعری کا رجحان عوام وخاص دونوں میں بہت مقبول تھا، بادشاہ، وزرا، امرا، روسا اور نوابین کے مصاحبین وملازمین میں شعرا اور ادبا کی بڑی قدر ومنزلت ہوتی تھی۔ غالب کے عہد میں مشاعروں اور شعری نشستوں کا رواج اپنے عروج پر تھا۔ آداب محفل کے پاس ولحاظ کے ساتھ مشاعروں کا انعقاد ہوا کرتا تھا جس میں بوڑھے، جوان، بچے ہر عمر کے لوگ بڑے ذوق وشوق سے شرکت کیا کرتے تھے۔ یہ مشاعرے عام طور پر عصر اور مغرب کے درمیان ہوا کرتے تھے۔ اہل علم وفن کے گھروں میں مہینے کی مقررہ تاریخوں میں نشستیں اور مشاعرے ہوتے تھے۔ ہر طرف شعر وشاعری کا ماحول بنا رہتا تھا۔ اظہارِ کمال کے لیے مشکل زمینیں رکھی جاتی اور طرحی نشستوں کا اہتمام ہوتا تھا۔ زیادہ تر بادشاہ، وزرا اور امرا شاعر ہوا کرتے تھے۔ خود بہادر شاہ ظفر صاحب دیوان شاعر تھے اور ظفرؔ تخلص کرتے تھے۔ دربار میں مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے اور ادبا اور شعرا کی خوب داد وتحسین کرتے اور انعام واکرام سے نوازتے رہتے تھے۔ ذوقؔ کے بعد غالب بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ اس دور کے شعرا میں بہادر شاہ ظفرؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، غالبؔ، مومن خان مومنؔ، امام بخش صہبائیؔ، شاہ نصیر الدین نصیرؔ، مفتی صدرالدین آزردہؔ، مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، مولانا فضل الحق خیر آبادی، ہرگوپال تفتہؔ، میر مہدی مجروحؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، عطا حسین عطاؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، حکیم عبدالرحیم خاں، مولوی سراج الدین قتیلؔ وغیرہ قابل ذکر تھے۔ بہرکیف مصوری، موسیقی اور شاعری وغیرہ تمام عوامل اس وقت کی تہذیبی اور ثقافتی روایت کا حصہ تھے۔

عہد غالب میں طرز رہائش اور طرز لباس وپوشاک بھی خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اس دور میں کچھ مخصوص لباس ہوا کرتے تھے، جیسے شاہ عجیدہ، شست خط، دوتاہی اور عذر وغیرہ۔ عذر کی بناوٹ اور شکل وصورت قبا کے مماثل تھی۔ ہاں اس کی بناوٹ میں فرق صرف اتنا تھا کہ عذر قبا کے مقابل لمبائی اور چوڑائی میں منفرد تھا۔ موسم سرما میں دبیز قسم کا لباس جسے قلبی کہتے تھے زیب تن کیا جاتا تھا۔ بالعموم اس وقت کے لباسوں میں زری کا کام ہوتا تھا۔ لبادے کی شکل میں ایک لباس ''الفچہ'' تھا، جس کا اوپری حصہ نہایت خوبصورت ہوتا تھا۔ بارش کے ایام میں ''چلمان'' نامی کپڑے کو استعمال کیا جاتا تھا جو بارش سے بچاتا تھا۔ اسی طرح زربفت کو بھی لوگ شوق سے استعمال کرتے تھے۔ سر کو ڈھاکنے کے لیے سرپوش کا استعمال ہوتا تھا۔ بادشاہ اور امرا حضرات کے سرپوش میں ہیرے اور جواہرات ٹکے ہوا کرتے تھے۔ اس وقت ریشم، مخمل اور کمخواب کے لباس عمومیت کے ساتھ استعمال کیے جاتے تھے۔ ٹکوچیہ، پیشواز، فرجی، فرگل، دستار، چیرہ، جامہ، کمربند، گیگھیا شاہانہ لباس تھے، جو عام طور پر بھڑکیلے اور چمکیلے ہوتے تھے۔ اس میں تراش خراش کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ عام وخواص میں رومال کا استعمال کثرت سے تھا۔ عورتیں اوڑھنی اور دوپٹے کو سر پر رکھتی تھیں اور شاہی گھرنے کی خواتین ٹوپی پہنا کرتی تھیں اور پردے کا خاص اہتمام کرتی تھیں۔ اس دور میں خادمائیں اور نچلے طبقے کی عورتیں کا پہناوا لہنگا ہوا کرتا تھا۔ آرسی، ہار، موتی کی لڑی، کڑے، بلاق، بالیاں، کان کا گوہر، بالا اس دور کی عورتوں کے عام زیورات تھے۔ عورتیں سنگار کی بہت

شوقین ہوا کرتی تھیں۔ اس دور میں خوشبو، عطر، لوبان وغیرہ کا استعمال بھی خوب ہوتا تھا۔

اس وقت کی شادیوں اور عام دنوں میں جو کھانے استعمال کیے جاتے تھے وہ بھی تہذیب کا ہی حصہ ہوا کرتے تھے۔ مختلف طرح کے پلاؤ، رنگ برنگے میٹھے چاول، مختلف قسم اور ذائقے کی نانیں مثلاً، باقر خانی، شیر مال، بادام بیسی، ذاتی، بیدھول، وارمی، جوار وغیرہ۔ بہت طرح کے گوشت تیار کرائے جاتے تھے۔ حلوؤں میں کباہ، ادرک، بادام، پستہ، شمس، شیر، ناخد، نشاستہ، فالودہ، فرنی، کھجور وغیرہ۔ اسی طرح قلیہ سادہ، قلیہ چاشنی دار، دوپیازہ، ماہی، ساموسہ، بادام و کباب خاص و عام میں مقبول تھے۔ پھلوں میں آم، خربوزہ، سردہ، سیب، انگور لوگ بہت پسند کرتے تھے۔ مردوں میں حقہ پینے اور پان کھانے کا رواج بہت عام تھا۔ عورتوں بھی پان کھانے کی شوقین تھیں۔ مغل کھانوں میں لذت کے ساتھ ساتھ نفاست کا بھی خیال رکھا جاتا تھا اور وہ اس کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کیا کرتے تھے۔

تہواروں میں خوب چہل پہل اور رونقیں ہوا کرتی تھیں محرم، عید الفطر، ہولی، دیوالی سبھی تہواروں میں بادشاہ شامل ہوا کرتے تھے اور لوگوں کو تحفہ عطیات وغیرہ تقسیم کرتے تھے۔ محرم کا چاند نظر آتے ہی سبیلیں لگائی جاتیں، ماتم کے باجے بجنے لگتے، بادشاہ حسنینؓ کے فقیر بنتے، سبز کپڑے پہنتے، گلے میں سبز کفنی اور جھولی ڈالتے اور بھری درگاہ میں جا کر سلام کر کے نیاز دیتے تھے۔ دس دنوں تک صبح کو کھانا اور شام کو شربت تقسیم کیا جاتا، چھٹی تاریخ میں بادشاہ خود لنگر کھینچتا۔ دیوالی کے موقعے پر روشنی کا خوب اہتمام کیا جاتا تھا۔ باجے بجتے تھے اور ہر طرف جشن منایا جاتا تھا۔ عہد غالب میں ہولی کا تہوار بھی بہت زور شور سے منایا جاتا تھا۔ شہر بھر میں سوانگ رچے جاتے تھے اور لوگ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر انعام اکرام حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح عید کے موقعے پر رات ہی میں توپیں، ڈیرے خیمے، فرش و فروش عیدگاہ روانہ کیے جاتے تھے۔ سواریوں کو تیار کیا جاتا، ہاتھی کو رنگا جاتا تھا۔ مختلف قسم کے نئے نئے عمدہ کپڑے پہنے جاتے تھے، جب بادشاہ عیدگاہ پہنچ جاتا تو اس کے استقبال میں توپیں داغی جاتیں اور بادشاہ کی سلامی ہوتی، اس کے بعد لوگ اپنے مصلے پر کھڑے ہو کر عیدگاہ میں نماز ادا کرتے تھے۔

اس دور میں تعلیم تعلم کا معقول نظم و نسق تھا۔ تعلیم کا طریقۂ کار یہ تھا کہ مساجد، مدارس اور خانقاہوں میں صبح کے وقت تعلیم دی جاتی تھی۔ اس وقت کے نصاب تعلیم میں تفسیر، حدیث، فقہ، علم نجوم، تاریخ، منطق، ریاضی، صرف، نحو، حکمت، بلاغت نصاب میں شامل ہوا کرتا تھا۔ تعلیم و تعلم کے علاوہ طلبا کے کردار، اخلاق، تربیت اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی خوب توجہ صرف جاتی تھی۔ نظم و ضبط کی خاص تلقین کی جاتی تھی اور اس کی برخلاف کرنے پر سخت سزا بھی ملتی تھی۔ عام طور پر رہائش کے لیے دار الاقامہ ہوا کرتے تھے جہاں طلبا رہ کر پڑھائی کرتے تھے۔ اس وقت کی تعلیم میں صحبت کا خاص دخل تھا، اس کے بغیر اس وقت تعلیم کا تصور ناقص سمجھا جاتا تھا۔ بالغان رشد و ہدایت اور اصلاح و تربیت کے لیے بزرگوں سے بیعت ہوتے اور ان کی صحبت اختیار کرتے

تھے۔ امرا اور روسا کے بچے تعلیم و تربیت کے لیے طوائف کے کوٹھے پر جایا کرتے تھے۔ اس وقت کا یہی تعلیمی نظام معاشرے میں رائج تھا۔

سواریوں میں گھوڑے، خچر، اونٹ، ہاتھی، گدھے، ٹم ٹم، پالکی، نالکی، ہوادار، تختِ رواں، بہل، چھکڑا، رتھ، چو پالہ، بیل گاڑی کا استعمال عام تھا۔

17.3.4 ماحصل

مذکورہ گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ عہد غالب کی معاشرت اپنے مخصوص خطوط کی بنیاد پر خاصی اہمیت کی حامل تھی۔ اس وقت کی سیاسی صورت حال اگر چہ ابتر تھی لیکن اس کے باوجود سماجی زندگی کا رکھ رکھاؤ، بول چال، رہن سہن، طور طریقے، شب و روز کے مشاغل اپنی تہذیبی وابستگی کے امین تھے۔ اس دور کی سیاسی صورت حال تشفی بخش نہیں تھی کیوں کہ سیاسی اتھل پتھل اپنے انتہا کو تھی، ہر طرف انگریزوں کا ظلم و جبر بڑھتا جا رہا تھا، ایسی صورت حال میں عہد غالب کی معاشرت اپنے انحطاطی دور سے گزر رہی تھی۔ سماج کی کسمپرسی میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، جس کے باعث نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تہذیب اپنی شناخت قائم کر رہی تھی تو دوسری تہذیب اپنے نقوش کو دھندلا کرتی جا رہی تھی۔ لہٰذا عہد غالب کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال نبرد آزمائی کے مراحل سے گزر رہی تھی۔

17.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ نے:

- غالبؔ کے عہد کے سیاسی مسائل سے واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کے عہد کے سیاسی اتھل پتھل کے اسباب و علل کی جانکاری حاصل کی۔
- غالبؔ کے عہد کی سماجی اور معاشرتی حالات و کوائف سے آگہی حاصل کی۔
- غالبؔ کے عہد کی تہذیب و تمدن کی معلومات حاصل کی۔
- غالبؔ کے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حقائق کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی۔

17.5 اپنا امتحان آپ خود لیجیے

۱۔ معظم شاہ کے مرنے کے بعد مغل تخت شاہی پر کون بیٹھا؟ اس کے کردار و اعمال پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

۲۔ بہادر شاہ ظفر کے دور حکومت پر مختصر اظہار خیال کیجیے۔

۳۔ عہد غالبؔ کی معاشرت کے چند نمونوں کو مختصراً تحریر کیجیے۔

۴۔ عہد غالب کی تعمیرات کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۵۔ غالب کے عہد کے کھان پان کی تفصیل بیان کیجیے۔

17.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ معظم شاہ کے انتقال کے بعد تخت شاہی کے حصول کے لیے خانہ جنگی شروع ہوگئی، جو مغلیہ سلطنت کے مکمل زوال کا سبب بنا۔ تختِ شاہی کے حصول کی جنگ میں جہاندار شاہ نے بازی لی اور سلطنت کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ لیکن ان کے ساتھ مسئلہ تھا کہ وہ افیم کا عادی اور شراب کی لت میں گرفتار تھا اور رات دن لال کنور کے عشق میں مست رہتا تھا۔ جنسی اطور میں ملوث رہتا تھا۔ جہاندار شاہ نے اپنی عیش پرستی اور لال کنور کے عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ سے فرخ سیر سے شکست کھائی اور اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا۔

۲۔ اکبر شاہ ثانی کے مرنے کے بعد ۷ اکتوبر ۱۸۳۷ء میں ان کے بیٹے سراج الدین بہادر شاہ ثانی کے لقب سے تخت شاہی پر بٹھائے گئے۔ یہ بہت دور اندیش تھے، یہ جانتے تھے کہ میری حیثیت تخت شاہی پر محض ایک ڈرامائی کردار کی طرح ہے۔ لیکن وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا انھوں نے شعر و شاعری کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ ۱۸۵۷ء میں جگہ جگہ بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے، لیکن انگریزوں نے ہندوستانیوں کو شکست دی، غدر میں کامیاب ہونے پر انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر پر بغاوت کا الزام لگا کر ان کو رنگون میں قید کر دیا گیا اور وہیں ۷ نومبر ۱۸۶۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔

۳۔ غالب کے زمانے میں دہلی کا لال قلعہ، جامع مسجد، اور چاندنی چوک دہلی والوں کی سماجی زندگی کا حصے تھے، جہاں لوگ ایک دوسرے سے ملتے، شاہی بازار اور دربار لگتے، پھول والوں کا میلا ہوتا وغیرہ۔ دہلی میں ہر ہفتے جمنا کے پل پر لوگ سیر کو جاتے تھے، جامع مسجد کے گرد ہر ہفتے بازار لگتا تھا، پھول والوں کا ہر سال میلا ہوتا تھا۔ قصیدے کہنا، محفلیں جمنا، مشاعرے ہونا، یہ سب اس وقت کے شوق ہوا کرتے تھے۔ لوگ اپنے گھروں میں کتب خانے بنوالیا کرتے تھے، لوگوں کے پاس کتابوں کے ذخیرے تھے۔ شاعری اور موسیقی کی ہر جگہ محفلیں گرم رہتی تھیں۔ امرا، روسا کا تو پوچھنا کیا ہر دولت مند آدمی کے یہاں با قاعدہ مشاعرے اور مجرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ عام و خاص سبھی شاعری اور لطف اندوزی کے ساز و سامان میں منہمک رہتے تھے۔ لال قلعے میں تمام شہزادے شاعری اور موسیقی میں ہمہ تن گوش رہتے تھے۔ شعر و سخن دہلی کے سماجی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ اس زمانے کی عوام اپنا زیادہ وقت کھیل تماشوں میں گزارتی تھی۔ دہلی کی جامع مسجد کے حوض کے چاروں جانب بازار کی رونقیں تھیں، ان بازاروں میں بٹیر، تیتر، کبوتر اور مرغ وغیرہ فروخت ہوا کرتے تھے۔ کیوں کہ اس وقت کبوتر بازی، مرغ بازی اور پتنگ

بازی سماج کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ جامع مسجد، جمنا کا پل، پھول والوں کی گلی، بارش مکان، بلی ماروں کا محلّہ وغیرہ سیر و تفریح اور وقت گزاری کے مراکز تھے۔

۴۔ مغل دور کی تعمیرات اپنے مخصوص تہذیب و ثقافت اور تمدن سے ہی عبارت ہیں۔ مثلاً محراب دار عمارتوں کی تعمیر اس وقت کی خاص پہچان تھی، زیادہ تر مکانات و محلات محراب نما بنائے جاتے تھے۔ یہ محرابیں دو طرح سے بنائی جاتی تھی گھڑ نالی محراب اور نوکیلی محراب، لیکن زیادہ تر اس دور میں گھڑ نالی محراب کے بجائے ہر چھوٹی بڑی عمارتوں میں نوکیلی محراب کا رواج عام تھا۔ اس دور میں لوگوں کو گنبد نما عمارتیں بنانے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا۔ بالخصوص تعمیرات میں گنبد سازی کی جاتی تھی۔ مغلوں نے تو اپنی بنائی ہوئی عمارتوں میں دو اور دو سے زائد گنبدوں کا التزام کیا ہے۔ اس عہد میں کی گئی تعمیرات میں عام طور پر لال پتھر اور خاص طور پر سنگ مرمر پتھر کا خوب استعمال کیا گیا ہے۔ باغات اور سرائے اس وقت کی تہذیب کا حصہ تھی۔ فن تعمیر کی خصوصیات میں شامل تھا کہ بیشتر عمارتوں میں باغات اور سرائے بنانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اسی طرح باغوں میں ’’سرو‘ درخت ضرور لگائے جاتے تھے۔ عام مکانوں میں مردان خانہ اور زنان خانہ علاحدہ علاحدہ بنائے جاتے تھے، جن میں کافی فاصلہ ہوا کرتا تھا۔ مکانوں میں عریض و وسیع آنگن رکھنے کا بھی رواج تھا۔ اس وقت نقش و نگار اور جالیوں سے عمارتوں کی تزین کاری کا رجحان بھی عام تھا۔

۵۔ اس وقت کی شادیوں اور عام دنوں میں جو کھانے استعمال کیے جاتے تھے وہ بھی تہذیب کا ہی حصہ ہوا کرتے تھے۔ مختلف طرح کے پلاؤ، رنگ برنگے میٹھے چاول، مختلف قسم اور ذایقے کی نانیں مثلاً، باقر خانی، شیر مال، بادام، بیسی، ذاتی، بیدھول، وارمی، جوار وغیرہ۔ بہت طرح کے گوشت تیار کرائے جاتے تھے۔ حلوؤں میں کباہ، ادرک، بادام، پستہ، شمس، شیر، ناخد، نشاستہ، فالودہ، فرنی، کھجور وغیرہ۔ اسی طرح قلیہ سادہ، قلیہ چاشنی دار، دو پیازہ، ماہی، ساموسہ، بادام و کباب خاص و عام میں مقبول تھے۔ پھلوں میں آم، خربوزہ، سردہ، سیب، انگور لوگ بہت پسند کرتے تھے۔ مردوں میں حقہ پینے اور پان کھانے کا رواج بہت عام تھا۔ عورتوں بھی پان کھانے کی شوقین تھیں۔ مغل کھانوں میں لذت کے ساتھ ساتھ نفاست کا بھی خیال رکھا جاتا تھا اور وہ اس کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کیا کرتے تھے۔

17.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
ثقافت	:	تہذیب
ہم آہنگی	:	مطابقت، ربط

جوبن	شباب، ابھار
رخت	سامان، اثاثہ
بصیرت	عقل، شعور
دگرگوں	بدلا ہوا، الٹ پلٹ
آویزش	لڑائی، کھینچا تانی
اتھل پتھل	تہ وبالا ہونے کی کیفیت، اوپر نیچے
دربدر	آوارہ، جلاوطن
اجیرن	وبال جان، کٹھن
غدر	ہنگامہ، سرکشی
افراتفری	ہلچل، کھلبلی
شعبدہ بازی	عیاری
سامراج	ملوکیت کا نظام، وہ نظام حکومت جو نوآبادیات پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے کیا جائے
خدوخال	چہرہ مہرہ، حلیہ
عالم نزع	جان نکلنے کی حالت
تازہ دم	ہشاش بشاش، توانا
اضطراب	بے چینی، پریشانی
منابع	سوتے، مخرج، ذرائع
پژمردہ	کملایا ہوا، مرجھایا ہوا، افسردہ
نظم ونسق	حکومت چلانے کا قاعدہ، قبضہ
سنگ	پتھر
کرۂ ارض	زمین کا گولا
تکملہ	کمال، ضمیمہ، پورا کرنا
میلان	جھکاؤ، خواہش
ارضیت	انسان کی مادی خواہش، علاقائیت کا احساس

ماورائیت	ناقابل فہم
تمدن	طرز معاشرت، سماجی زندگی
تزئین کاری	زیب و زینت کا عمل، سجاوٹ کا کام
قبا	وہ ڈھیلا ڈھالا لمبا لباس جو کپڑوں کے اوپر پہنا جائے
دارالاقامہ	ہاسٹل، طلبا کے رہنے کی جگہ

17.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	ہندوستان پر مغلیہ سلطنت	مفتی شوکت علی فہمی
۲۔	آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان	مبارک علی
۳۔	قدیم ہندوستان کی تاریخ	مترجم سید حسن نقوی
۴۔	مغل تہذیب	محبوب اللہ مجیب
۵۔	غالب کے خطوط	مرتبہ خلیق انجم
۶۔	غالب اور عہد غالب	مرتبین شاہد ماہلی/ رضا حیدر

اکائی 18 عہدِ غالبؔ کا شعری منظر نامہ

ساخت

18.1 اغراض ومقاصد
18.2 تمہید
18.3 عہدِ غالبؔ کا شعری منظر نامہ
    18.3.1 شعری منظر نامہ
    18.3.2 ماحصل
18.4 آپ نے کیا سیکھا؟
18.5 اپنا امتحان خود لیجیے
18.6 سوالوں کے جوابات
18.7 فرہنگ
18.8 کتب برائے مطالعہ

18.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- عہد غالبؔ کے شعری تصورات اور رجحانات سے واقف ہوں گے۔
- عہد غالبؔ کے شعری محرکات کے بنیادی اسباب وعلل سے روشناس ہوں گے۔
- عہد غالبؔ کے شعری منظر نامے کی اہمیت وافادیت سے متعارف ہوں گے۔
- عہد غالبؔ کے شعری منظر نامے کی معنویت سے واقف ہوں گے۔
- عہد غالبؔ میں زبان وادب کی تہذیبی وثقافتی صورت حال سے آگاہ ہوں گے۔

18.1 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ نے عہد غالب کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کا جائزہ لیا۔ اس جائزہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ غالب کا دور تمام جہتوں سے پر آشوب تھا۔ ہر شعبہ میں انگریزوں کا تسلط تھا، غدر اٹھارہ سو ستاون میں پورا ملک عدم تحفظ اور عدم اطمنان کا شکار تھا۔ ایک تہذیب مٹ رہی تھی تو اس کی جگہ دوسری تہذیب اپنے پاؤں پسار رہی تھی۔ ایسی صورت حال میں اس عہد کا ادبی اور شعری منظر نامہ کن خطوط، کن تصورات اور کن

امکانات کے ساتھ اپنے ارتقائی مراحل کو طے کر رہا تھا؟ انہیں جملہ سوالوں کے جواب کے لیے ہی زیرِ نظر اکائی کو مختص کیا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ عہدِ غالب کئی معنوں میں ایک عبوری دور تھا، جس میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی تغیر کے ساتھ شاعری کے منظرنامے میں بھی نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ لہٰذا اس اکائی میں آپ عہد غالب کے شعری منظرنامے کی تفصیلات کا مطالعہ کریں گے۔

18.3 عہدِ غالبؔ کا شعری منظرنامہ

18.3.1 شعری منظرنامہ

عہدِ غالبؔ کے شعری منظرنامے پر بحث کرنے سے قبل طلبہ کو یہ جاننا ضروری ہے کہ غالب ایک عہدِ آفریں شخصیت کا نام ہے۔ غالب کا عہد ہندوستان کی تاریخ میں ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی ''ان کو کسی خاص دور میں شامل نہیں کیا جاسکتا وہ خود ایک دور، ایک عہد یا ایک مزاج ہیں''۔ عہدِ غالب ہندوستانی تاریخ میں ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم میں بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عہدِ غالب کے شعری منظرنامے کی جڑیں غالب کے پیش روؤں سے ہی پیوست ہیں۔ ولی، سودا، درد، مصحفی، میر وغیرہ سے اردو شاعری کا منظرنامہ بتدریج آگے بڑھتا گیا لیکن عہدِ غالب کو سمجھنے کے لیے اردو شاعری کے ارتقائی سفر کو دیکھنا ضروری ہے۔ دہلی کو تاریخ، تہذیب، علم وفن، زبان وادب، شعروشاعری میں ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔

۱۷۲۰ء کو ولیؔ کا دیوان دہلی پہنچا تو عام بول چال کی زبان میں شعروشاعری کرنے کا رواج پا گیا۔ یہیں سے ریختہ خواص وعام کو عزیز ہوتی گئی اور آگے چل کر اردو کہلائی۔ اس دور کے خاص شعرا خان آرزو، حاتم، شاکر ناجی، مضمون، بیان، امید، مخلص وغیرہ ہیں۔ ایہام گوئی اس دور میں شاعری کے لیے رکاوٹ بنی مگر اس کے خلاف ردعمل کا آغاز ہوا جس کا سہرا حاتم، میر، مرزا مظہر جان جاناں اور یقین کے سر جاتا ہے جنہوں نے اردو شاعری کو ترقی کی منزلوں سے ہم کنار کرنے کے لیے اردو شاعری کو ایہام گوئی کے حصار سے آزاد کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ولی کی شاعری کا یہ مقام تھا کہ دہلی پہنچتے ہی اسے ہر کسی نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُن کی مقبولیت چاروں طرف پھیل گئی۔ وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

> ''ولی جب دہلی آئے تو اپنے ساتھ اپنی ثقافت کا سرمایہ بھی لائے۔ اس سرمائے میں ایرانی سکے یا Idioms کم سے کم تھے، ایسا نہیں ہے کہ ولی سے پہلے دکنی علاقے میں فارسی اور فارسی شاعری سے لوگ واقف نہیں تھے لیکن یہاں کے شعرا کی جڑیں اپنے لسانی نظام میں تھیں جو دوسرے لسانی نظام سے متصادم نہیں ہوئی تھی۔ ادھر شمال میں بیرونی تسلط کے تحت اشرافیہ ریختہ سے زیادہ فارسی پر زور دے رہا تھا۔ ولی کے

> پاس مقامی وراثت تو تھی ہی جب انھیں ریختہ کہنے کی ہدایت کی گئی تو ان کے مقامی رنگ کو ایک اور سمت مل گئی۔ فارسی نے ان کی مدد کی اور شمال کے ڈکشن نے ان کے رنگ کو مزید چوکھا کر دیا، گویا اسلوب اور ڈکشن کا یہ منظرنامہ جو ولی کے یہاں ہے اس ثقافتی وسعت کا نتیجہ ہے جس کی جڑیں ہندوستان کے ایک وسیع علاقے سے لے کر ایران تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ولی کی زبان میں فطری طور پر وسعت پیدا ہوگئی اور ساتھ ساتھ مضامین کے تنوع میں بھی خاصا اضافہ ہوگیا‘‘۔

(ولی: تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر، مرتبہ گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، ص: ۴۵)

ولیؔ اور ان کے معاصرین کے بعد غالبؔ کے پیش روؤں میں میرؔ اور سوداؔ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سے کلاسیکی اردو شاعری ایک نئی راہ پر گامزن ہوئی۔ میر اور سودا کا دور ایک ہی تھا میر نے دہلی کی بربادی دیکھی اور ذاتی طور پر بھی اپنی ساری زندگی آلام و مصائب میں گزار دی۔ جس کا عکس ان کے کلام میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ میر کا دور آپ بیتی سے جگ بیتی بن گیا۔ سودا کی طبیعت میر سے مختلف تھی جو بربادی اور غم کو ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔ دہلی کی بربادی پر شہر آشوب لکھ کر مذاق اڑایا۔ اردو قصیدہ نگاری میں سودا یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ میر اور سودا کے عہد کا اختصاص یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل جیسے اصناف شاعری کو فروغ ملا۔ ان کے دور میں اردو شاعری نے زبان و بیان کے لحاظ سے ترقی پائی اور شاعری کو صفائی اور جذبات کی صداقت سے آراستہ کیا۔ بقول نیاز فتح پوری ’’زبان و بیان کے لحاظ سے غزل گوئی نے اس زمانے میں بڑی نمایاں ترقی کی اور نہ صرف سودا و میر بلکہ اس عہد کے جس شاعر کا کلام اٹھا کر آپ دیکھیں گے تو زبان کی صفائی اور جذبات کی صداقت آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی‘‘۔

یہاں تک کہ دہلی کی شاعری کا روایتی رنگ ولیؔ سے لے کر میرؔ کے عہد تک ایک ہی آہنگ رکھتا ہے لیکن سوداؔ نے غزل کی تکنیک میں تنوع پیدا کر کے اس کو کئی تبدیلیوں سے آراستہ کیا۔ اس حوالے سے احمد محفوظ لکھتے ہیں:

> ’’میر تقی میر (۱۷۲۲ء تا ۱۸۱۰) کی شہرت اور مقبولیت کی بنیاد زیادہ تر ان کی غزلوں پر قائم کی گئی ہے۔ سب سے پہلے تذکرہ نویسوں نے میر اور سودا کا تقابل کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ یوں تو دونوں شاعروں کا مرتبہ یکساں ہے، لیکن غزل کے میدان میں میر کو سودا پر فوقیت ہے اور قصیدے میں سودا کو میر پر سبقت حاصل ہے۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خیال اس قدر بافتہ اور مستحکم ہوگیا کہ عموماً لوگوں نے میر کی شاعری کا مطالعہ ان کی غزلوں تک ہی محدود کر لیا‘‘۔

(احمد محفوظ، کلیات میر، جلد دوم، قومی کونسل برائے اردو زبان، نئی دہلی، ص: ۱۵)

اس عہد میں منفرد اور مخصوص طرز انداز رکھنے والے شاعر نظیر اکبرآبادی بھی موجود ہیں جو میر کے ہم عصر ہیں میر ہی کی طرح انھوں نے بھی کسی رجحان یا دبستان کی تقلید نہیں کی۔ نظیر اکبرآبادی کی شاعری کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کی شاعری کا رشتہ ہندوستان کی تہذیبی میراث سے مربوط اور مستحکم ہے۔ انھوں نے ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی روایتوں کا رس خوب پیا ہے۔ نظیر کا مطالعہ وسیع تھا، ان کے موضوعات غزل کی ساخت میں سما نہیں سکے، اس لیے انہوں نے نظم نگاری سے کام لیتے ہوئے اپنے خیالات کی وسعت کو بام عروج بخشا۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ نظیر نظم کے مقابلے میں غزل میں زور بیان اور ذخیرہ الفاظ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نزاکت اور لطافت وہ، کف پا تک کہ حیراں ہوں
سمن، گل لالہ، نسرین، نسترن، در، پرنیاں مخمل

نظیر اک عمر عشرت ہو، ملے ایسا پری پیکر
اگر اک آن، اگر اک دم، اگر اک چھن، اگر اک پل

غرض دہلی کی بربادی سے قبل عہدِ میر، سودا اور نظیر تک اردو شاعری کا رنگ ایک جیسا ہی رہا مگر جذبات کا داخلی رنگ اس میں صاف اور غالب نظر آتا ہے۔ اردو شاعری کے اس دور کو ہمیشہ وقار کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

عہدِ غالب کی ابتدا سے قبل ہی دلی سیاسی افراتفری کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ انتشار و اضطراب کا ایک روح فرسا ماحول قائم ہو چکا تھا اور اب یہاں گزارا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ یہاں کی آسودگی، رنگینی اور نشاط آمیز ماحول نے شعرا کی تخلیقی حیثیت کو متاثر کیا اور شاعری کے جدید رجحان کو اپنے دامن حصار میں لے لیا۔ دہلی کی شاعری کا جو خاصہ غم اور محبت تھا اب لکھنو آکر نشاط رندی میں تبدیل ہو گیا۔ دبستان دہلی میں فلسفہ وحدت الوجود اور تصوف کا اثر گہرا نظر آتا ہے کیوں کہ دہلی صوفیا کا اول سے ہی مرکز رہا ہے۔ میر، سودا، درد اور مرزا غالب کی شاعری میں تصوف کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ دبستان دہلی میں تصنع اور بناوٹ نہیں بلکہ تشبیہات و استعارات کا استعمال دلکش پیرائے اور سادگی سے ہوا ہے۔ یہاں داخلی واردات کے بیان کی آمیزش حسن و عشق کے خارجی معاملات کے بہ نسبت زیادہ ملتے ہیں۔ دبستان دہلی کے شعرا وصال سے زیادہ ہجر کے مشتاق نظر آتے ہیں۔ عشق و عاشقی ان کی شاعری کا موضوع خاص رہا ہے باوجود اس کے وہ پاکیزگی کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے سے اور دہلی کی بربادی کے بعد شعر و سخن کا مرکز لکھنو قرار پایا۔ غزل گوئی کو لکھنو کی رنگینیوں نے متاثر کر دیا۔ دبستان لکھنو نے داخلی واردات کے بجائے خارجی معاملات کو پیش کیا۔ جنسی جذبات کا اظہار یہاں عیب نہیں سمجھا جاتا، زبان میں لطافت پیدا کرنا ان کا مشغلہ بنا جس سے یہاں کی زبان دہلی سے زیادہ دل آویز نظر آنے لگی۔ یہاں کی رنگین فضا میں تصوف کے لیے جگہ نہیں، عیش و عشرت اور فارغ البالی نے لکھنو کی شاعری میں نشاطیہ رنگ بھر دیا۔ میر حسن، سوز، سودا، انشاء، مصحفی، ناسخ وغیرہ دبستان لکھنو کے اہم شعرا ہیں۔

کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد دہلی کی رونق پھر سے لوٹ آئی اور محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔ اب جس دور کا آغاز دہلی میں ہو رہا تھا یہ اردو شاعری کا دورعروج کہلاتا ہے۔ غالب اور ان کے معاصرین میں شاہ نصیر، ذوق، مومن اور بہادر شاہ ظفر نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ شاہ نصیر لکھنو کئی مرتبہ گئے اور ناسخ و آتش کے رنگ میں رنگنے لگے۔ خارجیت، تصنع، رعایت لفظی اور زور بیان جیسی خصوصیات شاہ نصیر کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ یہی خصوصیات لے کر وہ جب دہلی پہنچے تو دہلی کے شعرا نے بھی انھیں اپنانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ غالب بھی لکھنوی رنگ میں کچھ دیر کھو گئے لیکن اس رنگ کو اپنے مزاج کے موافق نہیں پایا اور جلد ہی دبستان دہلی کے مزاج کی جانب مراجعت کی۔ شاہ نصیر نے فن شاعری میں ایسا نام پیدا کیا تھا کہ ذوق، مومن، ظفر اور آرزو نے ان کی شاگردی اختیار کی۔

ہمیں اس اکائی میں غالب کے معاصرین سے بھی استفادہ کرنا لازمی ہے تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ عہدِ غالب میں غالب کے معاصر شعرا کی شاعری کا امتیاز کیا تھا۔ غالب کے معاصرین میں خاص طور پر شیخ محمد ابراہیم ذوق کا نام آتا ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم غلام رسول شوق کے مکتب میں حاصل کی، ان کے بعد مولوی میاں عبدالرزاق سے درسیات کی تکمیل کی۔ ان ہی کے مدرسے میں آزاد کے والد ماجد مولوی محمد باقر سے ملاقات ہوئی۔ ابتدا میں وہ شوق سے اصلاح لینے لگے اور انہی کے مشورے سے ذوق تخلص اختیار کیا۔ ان کے بعد وہ شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے لیکن ان کی طرف شاہ نصیر کی توجہ کم رہتی تھی۔ جو غزلیں ذوق اصلاح کے لیے لاتے تھے شاہ نصیر انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیتے تھے کہ 'طبیعت پر خوب زور ڈالو اور مزید غور و فکر کرو'۔ ذوق ان سے دل برداشتہ ہوتے تھے لیکن دوست و احباب ہمت بندھاتے اور مشاعروں میں پڑھنے کا مشورہ دیتے۔ اس طرح ذوق کی مشقِ سخن جاری رہی۔ شاہ نصیر اور ذوق کے درمیان چشمک بھی خوب رہتی تھی۔ جب شاہ نصیر حیدر آباد چلے گئے تو ان کے کچھ شاگرد ذوق سے اصلاح لینے لگے جن میں نواب الٰہی بخش خاں معروف خاص کر قابلِ ذکر ہیں جن کی وجہ سے ذوق کو شہرت ملی۔ ذوق بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی کے ساتھ ہی قلعے سے وابستہ ہو گئے، شاہ نصیر نے میر محمد کاظم کے لیے قلعے میں جانے کا موقع فراہم کیا تھا انہوں نے یہ موقع ذوق کے لیے فراہم کیا۔ بادشاہ کی طرف سے انہیں ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ شاہ نصیر کے سلسلے سے وابستہ ہونے کی بنا پر ذوق کا رنگِ سخن دلی پر حاوی ہو گیا اور بادشاہ کا استاد ہونے کہ وجہ سے بھی کئی شعرا ان سے وابستہ ہوتے گئے۔ ذوق کا مطالعہ واقعی وسیع تھا۔ ان کی شاعری میں فکر کی آمیزش تو ہے لیکن یہ بے ساختہ اور ثقیل ہے۔ اندازِ بیان سادہ تو ہے لیکن سپاٹ ہے جہاں الفاظ کو جوڑ کر اور ان پر زور دے کر شعر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذوق دراصل قصیدہ کے شاعر ہیں۔ سودا کے بعد قصیدہ نگاری میں ان ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ قصیدہ چوں کہ مدح ستائی پر مبنی صنف ہے، لہٰذا اس میں شاعر زبان دانی کی دھاک بٹھانا چاہتا ہے۔ ذوق کی شاعری میں اسی زبان دانی کی دھاک ملتی ہے جو اس دور کا ایک اہم رجحان تھا اسی وجہ سے وہ اس دور کے اہم شعرا میں تسلیم کیے جانے لگے۔ غالب، استادِ شاہ ہونے کی وجہ سے ذوق کو اپنا حریف تسلیم کرتے تھے اور ان دونوں کے درمیان ادبی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔

مومن خان مون نے کلب علی فائق کے بقول نو برس کی عمر میں شاعری شروع کی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی لیکن جب ناسخ کا کلام دلی پہنچا تو ان کی طرف مائل ہوئے اور بعد میں میر کا تتبع اختیار کیا۔ مومن بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، کیوں کہ اس دور میں غزل ہی محبوب و مرغوب صنف تھی۔ لیکن بقیہ شعرا کی طرح انھوں نے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی اور واسوخت میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزل میں تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرتِ اسلوب، مکر شاعرانہ جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ان کی غزل کے مضامین حسن و عشق کے معاملات کے گرد گھومتے ہیں۔ انھوں نے اس میں نسوانی پیکر کو پیش کیا جس کا ذکر ان کی غزل میں 'پردہ نشین' کے عنوان سے ملتا ہے۔ معاملہ بندی بھی مومن کی غزل کی بڑی خصوصیات میں شمار کی جاتی ہے۔ حسینوں سے چھیڑ چھاڑ، رقیب سے اپنے رویے کا اظہار، وصل و ہجر کی داستان معاملہ بندی میں بیان کیے جاتے ہیں۔ شاعری بیان کی شوخی اور عشق کے جذبے سے مغلوب ہو کر اگر ناگفتنی کو گفتنی بنا دے تو معاملہ بندی نازک مرحلہ بن جاتا ہے۔ ایسی ہی نازک خیالی مومن کی غزل کی اہم خصوصیت ہے۔ انھوں نے اس نازک خیالی میں ندرتِ اسلوب اور شاعرانہ شوخی کو استعمال کیا ہے۔ مکرِ شاعرانہ کے لیے بھی مومن جانے جاتے ہیں۔ اس صنعت کو انھوں نے خوبی سے برتا ہے۔ انھوں نے تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع کو بھی خوبی سے نبھایا ہے۔ فکر کی سطح پر دیکھیں تو جو غالب کی یہاں ہمہ گیر نظر آتی ہیں اور مومن کی فکر کا دائرہ و محور محدود ہے۔ غالب حیات و کائنات کے وسائل پر ایک حکیم، فلسفی اور دانشور کی طرح غور کرتے ہیں اور اس غور و فکر کو اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں اور مومن ایک عام راہ گیر کی طرح گزر جاتا ہے جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے اس کو بیان کرتا ہے۔ اس میں وہ مشکل الفاظ و اصطلاحات کو استعمال کرتا ہے لیکن مشکل الفاظ کسی کلام میں گہرائی پیدا نہیں کر سکتے۔ اسلم پرویز نے یہ بات صحیح لکھی ہے کہ 'مومن کی شاعری کا صرف ایک پہلو ایسا ہے جہاں وہ شعرائے متقدمین اور ہم عصر شعرا سے ممتاز نظر آتے ہیں اور وہ ہے ان کی عشقیہ شاعری۔' بقول شمس الرحمٰن فاروقی ''ابہام شاعری کی بہت بڑی خوبی اور تنقید کی سب سے بڑی لعنت ہے کیوں کہ شاعری میں تو ابہام نئے نئے معنی کے دروازے کھولتا ہے اور تنقید میں ابہام کے باعث نفس مطلب کا دم گھٹ جاتا ہے۔''

عہدِ غالب کے دیگر شعرا میں بہادر شاہ ظفر، شیفتہ، حالی وغیرہ نے بھی عہدِ غالب کے شعری منظرنامے میں اپنا حصہ ڈالا۔ ظفر شاعر اور شاعروں کے قدر داں تھے ان کی زبان پر ہندی کے اثرات اور ترنم دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ فن موسیقی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، جس سے ان کے کلام میں اچھوتا پن پیدا ہوتا ہے۔ شیفتہ اور حالی کا شمار اردو شاعری کے صاف اور خوش گو شعرا میں کیا جاتا ہے انھوں نے اصلاحی شاعری کو صاف انداز بیان کا جامہ پہنایا۔ شیفتہ کی صاف گوئی کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے:

نہ دیا ہائے مجھے لذت آزار نے چین
دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

خود غالب اپنے عہد کے نامور شاعر گزرے ہیں انھوں نے اردو شاعری کو ایک نئے آہنگ سے آراستہ کیا۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ ''غالب سے پہلے اردو شاعری دل والوں کی دنیا تھی، غالب نے اسے ذہن دیا''۔ غالب نے غزل میں نئے موضوعات شامل کر کے اسے وسعت بخشی۔ غالب کی مشکل پسندی، فارسی الفاظ کی کثرت سے نہیں بلکہ تخیل کی بلندی اس کا سبب تھا۔ عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ ''غالبؔ ایک بڑی رنگین، ایک بڑی ہی پرکار اور پہلو دار شخصیت رکھتے تھے اور اس رنگینی، پرکاری اور پہلوداری کی جھلک ان کی ایک ایک بات میں نظر آتی ہے۔'' یہ قول رشید احمد صدیقی کا ہے ''مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا؟ تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا غالبؔ، اردو اور تاج محل۔'' بہ قول ڈاکٹر محمد حسن ''دیوان غالبؔ کو ہم نئی نسل کی انجیل قرار دے سکتے ہیں۔'' بہ قول ڈاکٹر عبادت بریلوی ''اردو میں پہلی بھرپور اور رنگا رنگ شخصیت غالبؔ کی ہے۔'' ان کے کلام کی خصوصیات میں تہہ داری، شوخی و ظرافت اور غور و فکر کا انداز ملتا ہے۔ غالب فلسفی نہیں تھے لیکن فلسفیانہ انداز رکھتے تھے۔

غالبؔ کی شاعری اور نثر اپنے زمانے کے پس منظر میں نئی نسل کے لیے مطالعے کا ایک اہم ترین موضوع ہے۔ غالبؔ کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر زمانے میں موجود رہیں گے۔ باقی شعرا سے قدرے مختلف ہونے کے بدولت اُن کی شاعری میں تنوع اور رنگارنگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اسی طرح غالبؔ کی روشن خیالی اور آزادروی ہمارے زمانے کی نمائندگی کرتی ہے۔ دراصل غالبؔ زندگی کے ہر شعبے میں تجدید پسندی اور انفرادیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مستقبل کے سارے امکانات چھپے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ تشکیک، استفہام، تجسس اور انفرادیت کی وہ ساری چیزیں ان کے اشعار میں ملتی ہیں، جن کی ترکیب سے ایک ایسے زمانے کی تعمیر و تشکیل ممکن ہے، جو بہر حال غالبؔ کے بعد کا زمانہ اور ہمارے عہد سے ملتی جلتی صورت حال کی نمائندگی کرتا ہے لیکن یہ سب اُس عہد کا ہی عکس ہے جو غالب کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے دوران، فارسی ہندوستان میں ایک ادبی زبان کے طور پر بڑے پیمانے پر بولی اور استعمال کی جاتی تھی۔ یہ مغل دربار کی زبان تھی اور امرا اور دانشور بھی اسے استعمال کرتے تھے۔ مغل دور میں فارسی دربار کی سرکاری زبان اور انتظامیہ کی زبان بن گئی۔ یہ ادب، شاعری اور دیگر سماجی علوم کی زبان کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھی۔ اس دوران فارسی میں ادب کی بہت سی اہم تخلیقات لکھی گئیں۔ فارسی نے ہندوستان کی ثقافتی اور سماجی زندگی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ تاہم اٹھارویں صدی کے آخر تک، ہندوستان میں فارسی کا استعمال کم ہونا شروع ہوا اور بالآخر برطانوی نوآبادیاتی دور میں انتظامیہ اور تعلیم کی زبان کے طور پر اس کی جگہ اردو کے بعد انگریزی نے لے ہی لی۔

عہدِ غالب میں فارسی زبان اور فارسی شاعری 'نقش ہائے رنگ' تصور کی جاتی تھی، ایسے میں غالب کو بھی اپنے فارسی کلام پر ناز تھا۔ غالب نے اپنے اردو کلام کو خود ہی ''برگ از نخلستانِ فرہنگِ من'' کہا اور دعویٰ کیا کہ یہ بے رنگ

اردو شاعری کیا دیکھتے ہو۔ یہ تمہارے لیے باعثِ فخر ہوگی، میرے لیے تو موجبِ ننگ ہے۔ دیکھنا ہے تو میرا فارسی کلام دیکھو:

فارسی بیں، تا بینی نقش ہاے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

غالب کے کلام میں لفظ بولتے نظر آتے ہیں، انھوں نے مختصر لفظوں میں معنوں کے دفتر کھولے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لفظوں میں گنجینہ معنی وا کرنے کے لیے اِنہوں نے فارسی لفظیات سے ایسے پیکر تراشے ہیں کہ لفظ آب رواں کی مانند نہ صرف دوڑتے ہیں بلکہ اس دوڑ سے سوزِ دروں پیدا کرتے ہیں۔ کیوں نہ ہو ان کے کلام میں رنگارنگی،، فصاحت، بلاغت، روانی اور تہہ در تہہ جادوئی معنوی جادوئی ارتعاش پایا جاتا ہے۔ غالب نے بیدل کو اپنا استادِ فن مانا ہے، یہ بھی ایک وجہ ہے انہوں نے فارسی زبان سے کماحقہ استفادہ کیا ہے۔ بیدل فارسی زبان کے مسلم الثبوت اُستاد تھے، ان کے فکروفن کی عظمتوں کو ہر کس و ناکس نے تسلیم کیا ہے۔ بیدل کے تخیل کی بلندی، فکر کی گیرائی و گہرائی، بندشِ الفاظ سے معنوں کا جو طلسمی دریا موجزن ہوتا ہے اُس کی مثال اردو شاعری میں ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ غالب اردو شاعری میں ایک الگ ہی دنیا آباد کرنے جارہے تھے، اس لیے انہوں نے ولی اور میر کا تتبع کرنے کے بجائے بیدل کے انداز میں طلاطم کرنے کی کوشش کی۔ غالب نے شاعری میں مرزا بیدل کو ہی اپنا معنوی استاد منتخب کیا۔ غالب کی شاعری میں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کلامِ بیدل الہام کی صورت بن کر ان کے شعورِ تخلیق میں جذب ہوا ہو۔ آپ کو کلام غالب میں بھی جگہ جگہ طرز بیدل میں ریختہ کی قیامت نظر آئے گی، کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب فارسی میں سوچتے ہوں اور پھر اس فارسی سوچ کو اردو میں تبدیل کر کے صفحۂ قرطاس پر اتار رہے ہوں، کیوں کہ ولی سے میر تک حتیٰ کہ ناسخ کی زبان دانی سے آتشِ مرصع ساز تک اس طرح کی ترکیبیں، پیکر، بندشیں، محاورے، کہاوتیں اور لفظوں کی تراش وخراش اُس عہد میں کہیں نہیں ملتی اور جب نظر غالب پر جاتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے غالب بیدل کے وارث ہوں۔ وارث کرمانی لکھتے ہیں:

> ’’غالب اور بیدل کے باہمی رشتے کے بارے میں زیادہ صحیح رائے یہ ہوگی کہ غالب نے پچیس سال کی عمر تک بیدل کو اپنا اُوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔...... یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان کی شخصیت اور طرزِ فکر کی تشکیل عمر کے ابتدائی حصے ہی میں ہوتی ہے۔ چنانچہ غالب کو جو کچھ ذہنی اعتبار سے بننا تھا پچیس سال کی عمر تک بیدل کے زیر سایہ بن چکے تھے۔...... بنیادی طور سے وہ (غالب) بیدل ہی کے ساختہ پرداختہ رہے۔ غالب کی شاعری کا فلسفیانہ اور فکر انگیز لہجہ بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ

> لہجہ ان مبہم استعاروں اور پیچیدہ بندشوں میں لپٹا ہوا ہے جو اٹھارویں صدی کے اوائل ہی میں وضع کی گئی تھی۔ .... چنانچہ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے تصوف آمیز افکار، ان کا فلسفیانہ تجسس اور ان کے زمان و مکان کے باہر اُڑان بیدلؔ کے اثرات کا نتیجہ ہے۔''

(وارث کرمانی، شعری وراثت، غالبؔ کی فارسی شاعری، ۲۰۰۷ء، ص:۲۱)

غالبؔ نے بیدلؔ سے تصوف کا فلسفہ تو سمجھا، لیکن تصوف کے اس سفر میں غالب نے بیدل کی رہنمائی قبول نہیں کی۔ ہمیں یہاں پر غالبؔ کے اس طریقۂ تصوف سے انکار کو اس بات کے آئینے میں نہیں دیکھنا چاہیے کہ کہیں غالب نے بیدل کے تصوف کو ''قیامت ہے'' کی بنیاد پر دیکھا اور اس سے باہر نکل آئے، بلکہ غالب نے گوشہ نشینی کے بجائے وہ اُڑان بھر لی جہاں سے فکر اُن حدوں کو چھو آئی کہ عرش سے پرے لامکاں پر مکاں بنانے کے خواب بُننیں لگے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ غالبؔ بیدل کے تصوف کے متوالے نہیں، بلکہ اس کی زبان و بیان، لہجہ، معنی آفرینی اور اسلوب کی تہ داری سے اپنی شعری کائنات کی ایک نئی کہکشاں دریافت کی، لیکن یہ طرز طریق عہدِ غالب کی شاعری کا خاصا نہیں تھا اور یہی وجہ کہ غالب کو اپنے زمانے میں وہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جو انہیں ملنی چاہیے تھی۔ اس حوالے سے حالی لکھتے ہیں؛

> ''لوگ عموماً میر، سودا، میر حسن، جرات اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادا اور صاف کلام سننے کے عادی تھے جو محاورے، روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے انھیں کو اہل زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو ان کو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ ادھر قائل کے منھ سے نکلا اور ادھر سامع کے دل میں اُتر گیا مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ جیسے خیالات اجنبی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی... اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر اُن میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے۔ بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے جو نہ اُن سے پہلے اردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں۔''

(مولانا الطاف حسین حالی، یادگارغالب، ص:۱۰۲-۱۰۳)

یہی وجہ ہے کہ جب غالب نے مخصوص لفظوں سے مختلف اور منفرد کلام پیش کیا تو یہ کلام اُس عہد میں ایک دم انوکھا اور سمجھ سے باہر نظر آنے لگا۔ غالبؔ شاعری میں کسی نئی ہیئت کا تجربہ لے کر نہیں آئے تھے، بلکہ خطا یہ تھی کہ اُن کا

اسلوب نگارش ذرہ ہٹ کے تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ غالب کو اپنے زمانے میں وہ قدر و منزلت نصیب نہیں ہوئی جو اُنہیں ملنی چاہیے تھی اس پہ طرہ یہ کہ وہ تمام عمر ایک طرح کی نرگسیت کے نفسیاتی شکار رہے۔ تمام عمر خلعت، وظیفہ، خود بینی ایسی کہ ''الٹے پھر آئیں گے درِ کعبہ'' کے مترادف اور شاعری ایسی کہ خواص بھی بے بہرہ۔ حقیقت میں اگر غالب کی شاعری کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ اٹھارویں، انیسویں، بلکہ بیسویں صدی کو غالب کا عہد نہیں کہا جاسکتا، صحیح معنوں میں اکیسویں صدی غالب کی صدی ہے۔ غالب کو انسانی حیات کے متنوع گوشوں کا بڑی گہرائی و گیرائی کے ساتھ ادراک تھا، ایک فن کار کی طرح وہ زندگی کے باطن میں اتر جانے کا ملکہ رکھتے تھے اور انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو شدت سے محسوس کر کے اپنے تخیل کی رنگ آمیزی سے شاعری میں منتقل کرتے تھے۔

دراصل عہدِ غالب میں ہندوستان تہذیبی اعتبار سے نئی تقدیر لکھنے جا رہا تھا یہ تقدیر سازی آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں صاف نظر آئے گی، اس زمانے میں ہندوستان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصہ کلکتہ تھا اور غالب کو وظیفے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر کرنا پڑا اور کلکتہ کے اس سفر نے غالب کی ایک الگ تقدیر لکھ دی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مغلوں کے دورِ عروج کی داستانوں کا قصہ پارینہ ہو چکا تھا، مگر جیسے جیسے وہ زمانہ دور ہوتا گیا اس احساس نے ذہن کے دریچوں کو وا کیا کہ ہماری تہذیبی کہانیاں ختم ہو چکی ہیں اور اب لوگوں کے سامنے دو ہی صورتیں تھی یا تو روایات کو تھامے رکھنا تھا یا پھر روایات سے بغاوت لازمی بن جاتی تھی اور اگر خالی اپنی روایات ہی کو تھامے رہتے اُس صورت حال میں آگے بڑھنے کے تمام راستے بند ہو جاتے۔ ایسے دور میں جب دو نظام ہائے زندگی کی کشمکش ہو رہی ہو، تو ایک عام بے یقینی، حیرت اور تشکیک کا ہونا لازم ہے۔ غالب نے اس صورت حال کا بہ غائر مطالعہ کرنے کے بعد ایک الگ تصور پیش کیا۔ یعنی روایات کے ساتھ ساتھ متبادل اور کارآمد نظام جمال سے ایک نئی جمالیات کا آغاز۔ جیسا کہ ذکر ہوا کہ غالب کا سفرِ کلکتہ، ان کی زندگی میں ایک نئے اور معنی خیز موڑ کا سبب بنا، وہاں سے لوٹنے کے بعد غالب کا ذہنی سفر اور بھی نمایاں ہونے لگا جس کے بارے میں جمیل جالبی اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''غالبؔ کا واسطہ انگریزوں کے ساتھ بچپن سے رہا تھا اور چوں کہ وہ آزاد و غیر متعصب تھے، اس لیے جب کلکتہ گئے تو وہاں ''خوبان کشور لندن'' بھی دیکھیں اور 'بادہ ہائے ناب' کا مزہ بھی چکھا۔ کلکتہ میں جدید دور کا آغاز ہو چکا تھا اور یہاں کا ماحول دلی کے ماحول سے مختلف تھا۔ غالبؔ کے ذہن پر ان خیالات نے گہرا اثر ڈالا۔ مغلیہ سلطنت کا تماشا ان کے سامنے تھا، یہ سب چیزیں ان کے مزاج کا ایک حصہ تھیں۔''

(خلیفہ عبدالحکیم خلیفہ، افکارِ غالب، ۱۹۵۴ء، ص: ۱۴-۱۵)

غالب کے تخلیقی ذہن میں ان گنت تجربات کی دنیا آباد تھی ان کے فکر و نظر میں ایسی کشادگی موجود تھی جو دوسرے شعرا کے یہاں عنقا ہے۔ غالبؔ کے کلام میں مشکل پسندی اور دقت آمیزی کے باوجود ان کے اشعار زندگی کے ہر موڑ پر زخموں کا مداوا کرتے ہیں اور مسرت و انبساط کی دولت سے ہم کنار کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کو یہ امتیاز و انفراد بھی حاصل ہے کہ ان کے اشعار انسان کے داخلی جذبے اور فکر کو تحریک بخشتے ہیں جس سے قاری کو آسودگی کے ساتھ ساتھ بصیرت اور وژن کی دولت بھی عطا ہوتی ہے۔ غالبؔ کی آفاقی شخصیت ہندوستان کی لازوال تہذیبی میراث ہے اور ان کا کلام ہندوستان کے تہذیبی ورثے میں جواہر پارے کا درجہ رکھتا ہے۔ غالب کی غزلیہ شاعری میں متنوع عناصر موجود ہیں جن عناصر کی بدولت قارئین کی حسیات پر ایک خاص تاثر قائم ہوتا ہے۔

18.3.2 ماحصل

انیسوی صدی کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک طرف مغلوں کی سیاسی وحدت کا چراغ ماند پڑ رہا تھا تو دوسری جانب انگریز بے محابا جبر و تشدد، ظلم و ناانصافی اور انتشار و انارکی کی ایک بھیانک تاریخ رقم کر رہے تھے۔ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی صورت حال اتنی ناگفتہ بہہ تھی کہ مغل بادشاہوں کا سیاسی انتداب، جاہ و جلال نیز فنکاروں اور دانشوروں کی عظمت و سطوت پر بھی اندیشۂ زوال سایہ فگن ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات، انگریزوں کا تسلط اور بہادر شاہ ظفر کا رنگون جلاوطنی، یہ واقعات، ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں نزاج اور انتشار کے سنگ ہائے میل ہیں۔ ولی سے لے کر عہدِ میر تک دہلی کی شاعری کا روایتی رنگ و آہنگ کسی حد تک مشترک ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے تخلیقی سطح پر انفرادی راہ اختیار کرتے ہوئے ہندوستان کی مقامی بولیوں اور ان میں موجود عام بول چال کے لفظوں کو تخلیقی پیرہن بخشا۔ نظیر کے اس تخلیقی رویے کا اپنا حسن ہے۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کی شاعرانہ خصوصیات اور امتیازات عہد غالب کی مخصوص پہچان ہے۔ غالب اور ان کے معاصرین میں شاہ نصیر، ذوق، مومن اور بہادر شاہ ظفر کی شاعرانہ خوبیوں سے عہد غالب کے غالب تصورات اور شعری منظرنامے کے خدوخال سامنے آتے ہیں۔

18.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- عہد غالبؔ کے شعری منظرنامے کی صورت حال سے واقفیت حاصل کی۔
- عہد غالبؔ کے غالب رجحانات سے آگہی حاصل کی۔
- عہد غالبؔ کے نمایاں شعری ریوں کی جانکاری حاصل کی۔
- عہد غالبؔ کے نمایاں شعرا کے شعری امتیازات کا ادراک کیا۔

- عہد غالبؔ کے شعری مزاج، تصورات اور امکانات کا شعور حاصل کیا۔

18.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ رشید احمد صدیقی کے اس قول کو تحریر کیجیے جس میں انھوں نے غالب کی شخصیت کو دور سے تعبیر کیا ہے۔

۲۔ مومنؔ کی غزلوں کی خصوصیات مختصراً بیان کیجیے۔

۳۔ عہد غالبؔ کے ماحول سے پیدا ہونے والے کسی ایک اہم وصف کو بیان کیجیے۔

۴۔ شاہ نصیر کی شاعری کے رنگ و مزاج کے اثرات دہلی کے شعرا پر کیوں کر مرتب ہوئے؟ اختصار سے بیان کیجیے۔

۵۔ ذوقؔ دہلوی نے اپنی شاعری کی اصلاح کن لوگوں سے لی اور شاہ نصیر سے چشمک کیوں کر پیدا ہوئی؟ واضح کیجیے۔

18.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ غالبؔ کی شخصیت کے متعلق رشید احمد صدیقی کا قول ہے کہ ’’ان کو کسی خاص دور میں شامل نہیں کیا جا سکتا وہ خود ایک دور، ایک عہد یا ایک مزاج ہیں۔‘‘

۲۔ مومنؔ کی غزل میں تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرتِ اسلوب، مکر شاعرانہ جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ان کی غزل کے مضامین حسن وعشق کے معاملات کے گرد گھومتے ہیں۔ معاملہ بندی بھی مومن کی غزل کی بڑی خصوصیت ہے۔ نازک خیالی بھی مومن کی غزل کی اہم خصوصیت ہے۔ انہوں نے نازک خیالی میں ندرتِ اسلوب اور شاعرانہ شوخی کو استعمال کیا ہے۔ مکرِ شاعرانہ کے لیے بھی مومن جانے جاتے ہیں۔ اس صنعت کو انہوں نے خوبی سے برتا ہے۔ انہوں نے تشبیہات واستعارات اور صنائع وبدائع کو بھی خوبی سے نبھایا ہے۔

۳۔ عہدِ غالبؔ میں چوں کہ سیاسی افراتفری، انتشار واضطراب کا ایک روح فرسا ماحول تھا، اس ماحول نے شعرا کی تخلیقی حیثیت کو بہت متاثر کیا اور جدید رجحان کو شاعری کے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی، یہی عہد غالب کا اہم وصف تھا۔

۴۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہ نصیر متعدد مرتبہ لکھنؤ گئے اور ناسخ وآتش سے متاثر ہو کر ان ہی کے رنگ میں رنگنے لگے۔ خارجیت، تصنع، رعایت لفظی اور زور بیان جیسی خصوصیات شاہ نصیر کے کلام میں نظر آنے لگی اور جب یہی خصوصیات لے کر وہ جب دہلی پہنچے تو دہلی کے شعرا نے بھی انھیں اپنانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ غالب

بھی لکھنوی رنگ میں کچھ دیر کھو گئے، لیکن اس رنگ کو اپنے مزاج کے موافق نہیں پایا اور جلد ہی دبستان دہلی کے مزاج کی جانب مراجعت کی۔ شاہ نصیر نے فن شاعری میں ایسا نام پیدا کیا تھا کہ ذوق، مومن، ظفر اور آرزو نے ان کی شاگردی اختیار کی۔

۵۔ ذوقؔ دہلوی ابتدا میں غلام رسول شوقؔ سے اصلاح لینے لگے اور انہی کے مشورے سے ذوقؔ تخلص اختیار کیا۔ ان کے بعد وہ شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے لیکن ان کی طرف شاہ نصیر کی توجہ کم رہتی تھی۔ جو غزلیں ذوق اصلاح کے لیے لاتے تھے شاہ نصیر انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیتے تھے کہ 'طبیعت پر خوب زور ڈالو اور مزید غور و فکر کرو'۔ اسی باعث ذوق ان سے دل برداشتہ ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ کے درمیان چشمک پیدا ہوگئی۔

18.7 فرہنگ

(الفاظ)	(معنی)
منظرنامہ	صورت، صورت حال
ثقیل	بھاری، بوجھل
اسالیب	طور طریقے، اطوار
عبوری	ہنگامی، عارضی
اختصاص	خاص، امتیاز، برتری
باریاب	حاضر، داخل، کامیاب
نشیب و فراز	بلندی و پستی، اونچ نیچ
عریض	بڑا، چوڑا
تغیر	تبدیلی
فراق	جدائی، فرقت
معدودے	قلیل تعداد میں، چند
مقصود	مراد، غرض
پیش رو	آگے چلنے والا، قائد جس کی پیروی کی جائے
آشوب	فتنہ، فساد، پریشانی
پیچ و خم	موڑ، کجی، چکر

چشمک	چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک
آسودگی	راحت، آرام، سکون
نشاط	خوشی، شادمانی
ابہام	مبہم، غیر واضح
اجمال	مختصر، قلیل
مشتاق	آرزومند، طالب ہونا
عشرت	عیش و آرام

18.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	تاریخ ادب اردو	جمیل جالبی
۲۔	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ
۳۔	ذکر غالبؔ	مالک رام
۴۔	غالب اور عہدِ غالب	شاہد ماہلی
۵۔	غالب: شخصیت اور عہدِ	پون کمار ورما

اکائی 19 غالبؔ کے سوانحی حالات وکوائف

ساخت

19.1 اغراض ومقاصد

19.2 تمہید

19.3 غالبؔ کے سوانحی حالات وکوائف

 19.3.1 غالبؔ کے حالات زندگی

 19.3.2 ماحصل

19.4 آپ نے کیا سیکھا؟

19.5 اپنا امتحان خود لیجیے

19.6 سوالوں کے جوابات

19.7 فرہنگ

19.8 کتب برائے مطالعہ

19.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- غالبؔ کے آبا واجداد سے واقف ہوں گے۔
- غالبؔ کی پیدائش، تعلیم وتربیت اور شعری شغف سے متعارف ہوں گے۔
- غالبؔ کی ازدواجی اور سماجی زندگی سے آگاہ ہوں گے۔
- غالبؔ کی زندگی کے مسائل، معاشی صورت حال اور مصاحبین کی اعانت سے واقف ہوں گے۔
- غالبؔ کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں سے روشناس ہوں گے۔

19.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے غالب کے عہد کے شعری منظر نامہ کا مطالعہ کر کے بہ خوبی سمجھ لیا ہوگا کہ عہد غالب کا ادبی اور فکری ماحول کیسا تھا، اس وقت کے مروجہ شعری تصورات، افکار اور نظریات کیا تھے اور ان میں کس قدر تبدیلیاں واقع ہوئیں، ان تغیرات کے باعث اردو شاعری پر کیا اثرات مترتب ہوئے اور غالب نے

اس عہد میں اپنی شاعری کو کن خطوط پر پروان چڑھایا۔ الغرض یہ کہ اس دور کے نمائندہ شعرا کا شعری رنگ و آہنگ اور اس عہد کی شعری صورت حال سے بھرپور واقفیت حاصل کی۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے حیات وشخصیت کا مطالعہ کریں گے، جس میں ان کے خاندان، تعلیم و تربیت، پرورش و پرداخت، ازدواجی زندگی، اولاد وغیرہ اور ان کی زندگی کے متعدد گوشوں سے متعارف ہوں گے۔

19.3 غالبؔ کے سوانحی حالات وکوائف

19.3.1 غالبؔ کے حالات زندگی

مرزا غالب کا نام اسد اللہ خاں تھا اور مرزا نوشہ ان کی عرفیت تھی۔ شاہی خطاب نجم الدولہ و دبیر الملک نظام جنگ تھا۔ تخلص اسدؔ اور غالبؔ دونوں تھے۔ ان کے تخلص کے حوالے سے یہ قصہ بھی مشہور ہے کہ کسی نے میر امانی اسد کے شعر کو تخلص کی بنیاد پر غالب کا شعر سمجھ کر شعر سے لطف اندوز ہو کر داد دی اور غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا جناب مجھے آپ کا یہ شعر بہت پسند آیا، تو انہوں نے کہا کہ میرا کون سا شعر آپ کو پسند ہے، ذرا شعر پڑھیں، تو انہوں نے غالب کو میر امانی اسد کا یہ شعر سنایا: ''اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی - میرے شیر شاباش رحمت خدا کی'' یہ شعر سنتے ہی غالب کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے جواب میں کہا کہ ''حضرت اگر یہ کسی اور اسدؔ کا شعر ہے تو اس پر رحمت خدا کی اور اگر یہ مجھ اسدؔ کا ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی'' اور اتنے دلبر داشتہ ہوئے کہ اسد نامی تخلص کو ہی خیر باد کہا اور اپنا تخلص غالبؔ رکھا اور اسی تخلص سے پوری دنیا میں مشہور و معروف ہوئے۔

غالبؔ کی پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ء بہ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو بدھ کی رات آگرہ میں ہوئی (یادگار غالب، حالی، ص: ۱۵)۔ جہاں تک غالب کے آباؤ اجداد کا تعلق ہے وہ نہ تو دلی کے رہنے والے تھے اور نہ ہی موروثی اعتبار سے آگرہ کے رہنے والے تھے۔ مرزا غالب کے پردادا کا اسم گرامی مرزا قوقان بیگ تھا۔ جن کی پشتینی وابستگی ترک قوم سے تھی اور ان کا نسبی انضمام توران ابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ جب تورانیوں کا جاہ و جلال کیانیوں کے عروج و اقبال کی آندھی میں غبار کی طرح اڑ گیا تو حکمران خاندان کے باقی ماندہ افراد اپنے وطن کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے۔ تاریخ نے پھر کروٹ بدلی اور اسلامی عہد میں اس خاندان نے اپنی منظّم کوششوں سے ایک مہتم بالشان سلطنت کی داغ بیل ڈالی جسے تاریخ میں سلجوقی سلطنت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس عظیم الشان سلطنت کے سورج کو بھی جب گرہن لگا تو سلطنت سے منسلک افراد مخلوق الحالی اور پسماندگی کا شکار ہو گئے۔ ان ہی میں ایک کا نام شہزادہ ترسم خان تھا جو سمرقند میں جا بسا۔ غالبؔ اسی ترسم خان کی اولاد میں سے تھے۔

غالبؔ کے پردادا مرزا قوقان بیگ پہلے لاہور میں نواب معین الملک بہادر کی ملازمت میں داخل ہوئے پھر معین الملک کی وفات پر لاہور سے دہلی پہنچے اور نواب ذوالفقار الدولہ میر نجف خان بہادر کے نظام حکومت سے وابستہ

ہوگئے۔ لیکن جلد ہی یہاں سے مستعفی ہونے کے بعد انہوں نے مہاراجہ جے پور کے یہاں خدمات انجام دی اور آگرہ کو اپنا مسکن بنایا۔ قوقان بیگ کی شادی ۱۷۶۳ء میں ہوئی اور ان کی اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں جن میں صرف ان کے دو صاحبزادوں کا نام محفوظ ہے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان اور مرزا نصراللہ بیگ خان۔ مرزا عبداللہ بیگ خان غالبؔ کے والد بزرگوار ہیں اور ان کی ولادت دہلی میں ہوئی۔

غالبؔ کی والدہ عزت النسا بیگم میرٹھ سرکار کے ایک فوجی افسر خواجہ غلام حسین کمیدان کی دختر نیک اختر تھی۔ جن کی شادی ۱۷۶۵ء کو مرزا عبداللہ بیگ خان سے ہوئی۔ انہیں دونوں کو دنیائے شاعری کے نابغۂ روزگار شاعر مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے والدین کا طرۂ امتیاز حاصل ہوا۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ مرزا غالبؔ کے والد راجہ بختاور سنگھ کی طرف داری میں لڑتے ہوئے گولی کا نشانہ بنے تھے اور راج گڑھ کے مقام پر ایک باغی زمین دار سے لڑتے زخموں کی تاب نہ لاکر انتقال کر گئے اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ اس وقت غالبؔ کی عمر محض پانچ سال کی تھی۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی شرح دیوان غالبؔ میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''غالبؔ کا اصلی نام مرزا اسداللہ بیگ خان تھا۔ مرزا نوشہ عرف تھا اور ''نجم الدولہ ودبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ'' خطاب تھا باپ کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا جن کی شادی آگرہ میں مرزا غلام حسین خاں کی بیٹی عزت النسا بیگم سے ہوئی تھی۔ ان ہی کے بطن سے غالبؔ پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ۲۷؍دسمبر ۱۷۹۷ء ہے۔''

(یوسف سلیم چشتی، شرح دیوان غالب، ص:۲۴)

غالبؔ کی پرورش کی تمام تر ذمہ داری والد کے انتقال کے بعد چچا مرزا نصراللہ خان بیگ نے انجام دی، لیکن مرزا غالبؔ کی سیاہ بختی کہ یہ سایہ بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا۔ مرزا نصراللہ بیگ ۱۸۰۶ء میں ایک معرکہ کے دوران ہاتھی سے گر کر شدید زخمی ہوئے اور یہی ان کے سانحہ ارتحال کا موجب بنا۔ چوں کہ اس بات کے تاریخی شواہد موجود نہیں کہ مرزا نصراللہ بیگ کی وفات ۱۸۰۶ء کے کس ماہ میں میں ہوئی اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت غالبؔ کی عمر محض آٹھ سے نو برس کی تھی۔ غالبؔ نے دوستوں کے نام خطوط میں اس صدمہ عظیم کو اپنے اور اپنے بھائی کے لیے دوبارہ یتیمی کے مترادف قرار دیا ہے۔ مرزا غالب کے ننھیالی مالی اعتبار سے آسودہ اور خوش حال تھے۔ لہٰذا انہوں نے غالب کی پرورش بڑے ناز ونعم سے انجام دی۔ انہوں نے غالبؔ کی ابتدائی اور مروجہ تعلیم پر خاطر خواہ توجہ مبذول کی۔ غالبؔ نے آگرے میں مولوی محمد اعظم سے تعلیم حاصل کی۔ غالبؔ نے فارسی زبان و ادب کے اسرار وغوامض ملا عبدالصمد سے حاصل کیے (یادگار غالب، ص:۲۰) جس کا ثبوت غالبؔ کی تصانیف ''لطائف غیبی'' اور ''درفش کاویانی'' سے ملتا ہے کہ ملا عبدالصمد سے شرف تلمذ کے وقت غالب کی عمر چودہ برس کی

تھی، اس طرح انھوں نے ابتدائی زمانے میں ہی فارسی شعر وسخن کا اعلیٰ ذوق پیدا کرلیا۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ’’غالبؔ بچپن ہی میں یتیم ہوگئے تھے، اس لیے ان کی پرورش ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں نے کی لیکن جب وہ آٹھ سال کے ہوئے تو چچا بھی فوت ہوگئے۔ مگر نواب احمد بخش بیگ نے مرزا کے خاندان کے لیے انگریزوں سے وظیفہ مقرر کرادیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری عمر ان کے ثنا خواں رہے۔
>
> مرزا نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد معظم صاحب سے حاصل کی لیکن ان کی خوش قسمتی سے ۱۸۱۱ء میں جب ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی ملا عبدالصمد نامی ایک ایرانی عالم جو نومسلم تھا سلسلہ سیر وسیاحت سے وارد آگرہ ہوا انھوں نے دو سال تک اس سے تعلیم حاصل کی۔‘‘

(یوسف سلیم چشتی، شرح دیوان غالب، ص: ۲۵-۲۴)

۹ اگست ۱۸۱۰ء کو مرزا غالبؔ کی شادی نواب احمد بخش خان بہادر والی لوہارو کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خان کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ غالبؔ کی حیات کا یہ وہ زمانہ ہے جب عیش وعشرت اور فارغ البالی کے ایام چل رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ان کی شخصیت میں اس ناز ونعم نے ایسی عادتیں اور بے اعتدالیاں پیدا کیں کہ ان کی شخصیت فطرت ثانیہ کا درجہ اختیار کرگئیں۔ امتداد زمانہ کے ساتھ کچھ عادتوں سے چھٹکارا حاصل تو ہوا لیکن بعض تادم زیست غالبؔ کی عسرت اور معاشی ہبوط کا محرک بن گئیں۔ حالاں کہ دہلی آتے جاتے تھے لیکن ۱۸۱۲ء میں غالبؔ نے آگرہ کی سکونت ترک کرکے مکمل طور پر دہلی میں قیام کیا۔

دہلی کے ادبی اور علمی ماحول میں غالبؔ کی تخلیقی حذاقت/ فطانت کو مہمیز عطا ہوئی۔ دہلی کو اس وقت یہ امتیاز حاصل تھا کہ مغلیہ حکومت کا دارالسلطنت ہونے کے باعث آگرے کی بہ نسبت تعلیمی، ادبی اور کچھ حد تک اقتصادی وسائل کی فراوانی بھی تھی اور غالبؔ نے اس ماحول میں اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کی، لیکن یہاں آکر نئی زندگی کے نئے تقاضوں نے مسائل کی جو زنجیر غالبؔ کے لیے تیار کی اس سے انہیں زندگی بھر رہائی نہ مل سکی۔ سنجیدگی، متانت اور شخصیت سازی کی آرزو ان کی حیات کا نقطہ ارتکاز قرار پایا اور وہ علمی، فکری اور ادبی مناصب میں رفعت اور سطوت کے زینے طے کرتے گئے، البتہ وقت کے ساتھ ساتھ غالبؔ کی شخصیت کو معاشی الجھنوں نے مقید کر کے رکھ دیا اور آگرے کی عیش وعشرت سے بھرپور حیات ان کے لیے خواب بن کر رہ گئی۔ غالبؔ جب تک آگرے میں مقیم رہے انہیں اپنی معاشی واماندگی کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔ مالک رام کے بقول ’’انہیں خرچ کی

کوئی تنگی نہ تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روپے پیسے کی افراط تھی۔'' غالبؔ کو دہلی کے ابتدائی ایام میں معاشی اعتبار سے زیادہ صعوبتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ساڑھے سات سو روپے سالانہ پنشن نواب احمد بخش خان کی وساطت سے ملتی تھی لیکن آہستہ آہستہ غالبؔ کے اخراجات اور آمدنی میں توازن بگڑنے لگا اور غم روزگار کا حصار ان کے گرد تنگ ہوتا گیا۔ غالبؔ کے والد مرزا نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد جس جاگیر سے ان کو حصہ ملتا تھا وہ جاگیریں بھی نواب احمد بخش خان کے حصہ میں شامل ہوگئیں۔ نواب احمد بخش خان نے اپنی جاگیروں کو اولادوں میں منقسم تو کیا لیکن غالب کا حصہ نواب شمس الدین خان فیروز پور کے اختیار میں چلا گیا، جس کی غالبؔ کے ساتھ مخاصمت تھی اور انہیں قوی یقین تھا کہ وہ اس کی ادائیگی میں مسائل پیدا کر دیں گے اور ایسا ہی معاملہ ہوا غالبؔ نے بالآخر مقدمہ دائر کرنے کے لیے کلکتہ کا قصد کیا۔ یہ ایک طرح سے غالبؔ کے لیے جدوجہد حیات کا مرحلہ تھا۔ اس حوالے سے خلیق انجم اپنی کتاب ''غالبؔ کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''غالبؔ کی پنشن کا قضیہ ۱۸۰۶ء میں اس وقت شروع ہوا تھا، جب غالبؔ ابھی نو سال کے تھے۔ اس وقت ان کے والد اور چچا کا چھوڑا ہوا اثاثہ اتنا تھا کہ ان کی اور اہل خاندان کی زندگی عیش و آرام سے گزر رہی تھی اور پھر چوں کہ خاندان میں غالبؔ اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف بیگ کے علاوہ اور کوئی مرد نہیں تھا اور یہ دونوں کم عمر تھے، اس لیے پنشن کے سلسلے میں نواب احمد بخش خاں نے ان کے ساتھ جو ناانصافی کی تھی، اس کا انھیں پتا بھی نہیں چلا لیکن جب وہ سن بلوغت کو پہنچے تو انھیں اس ناانصافی کا پتا ہوا۔ غالبؔ نے بارہا نواب احمد بخش خان کی توجہ اس ناانصافی کی طرف مبذول کرا کے اپنا جائز حق مانگا لیکن نواب احمد بخش خاں نے غالبؔ کے مطالبات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ مجبور ہو کر ۱۸۲۸ء کو غالبؔ نے ایک عرض داشت کے ذریعے کلکتے میں حکومت کی توجہ اس ناانصافی کی طرف مبذول کرائی۔ خط کے متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کے نام پنشن کے سلسلے میں غالبؔ کی یہ پہلی عرض داشت تھی۔''

(خلیق انجم، غالبؔ کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، ص: ۸۵)

۱۸۲۸ء کو غالب کلکتہ پہنچے۔ انہوں نے اس سفر کے دوران لکھنؤ اور بنارس میں بھی قیام کیا یہ سفر غالبؔ کی تخلیقی شخصیت کے اعتبار سے اہم ہے کیوں کہ اس سفر نے راست طور پر غالبؔ کے افتاد طبع اور شاعری پر دور رس اثرات مرتسم کیے۔ دیار کلکتہ کا سفر غالبؔ نے جس مقصد کے لیے کیا تھا اس میں خاطر خواہ کامیابی تو حاصل نہ ہو سکی البتہ یہاں کی ادبی اور ثقافتی منظر نامے کی بوقلمونی نے غالبؔ کے تخلیقی وژن کو متاثر کیا۔ محققین کے مطابق ''کلکتہ

میں لوگوں نے مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی کافی خاطر مدارت کی اور ان کو کامیابی کی امید بھی دلائی۔'' قیام کلکتہ کے دوران کئی لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیا۔ غالبؔ کی شخصیت میں خودی اور اعتماد اس قدر موجود تھا کہ وہ ہندوستان میں امیر خسرو کے علاوہ کسی کو بھی لائق اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں حالی نے ''یادگارِ غالبؔ'' میں ان کا ایک خط نقل کیا ہے ''اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم ثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔'' مرزا نے ایک مثنوی میں باد مخالفت کے عنوان سے تخلیق کی جس میں انہوں نے قیام کلکتہ کے دوران معترضین کے اعتراضات اور اپنے جوابات کے علاوہ اپنی غریب الدّیاری کو نہایت فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ غالبؔ کلکتہ میں مغرب سے آئے ہوئے، نئے نظام سے متاثر ہوئے تھے۔ جب کلکتہ کی صنعتی ترقی وتہذیبی زندگی ان کے مشاہدے میں آئی تو زندگی اور فکر وفن کے باب میں اُن کے ذہن کے دروازے کچھ اور کُھل گئے۔ وہ کلکتہ کی نئی تہذیبی زندگی سے بدگمان نہیں ہوئے، بلکہ انہیں یہ تہذیبی زندگی پسند آئی۔ کلکتہ کی نئی رونق سے غالب اس قدر متاثر تھے کہ واپس آ کر سراج الدین احمد کو ایک فارسی میں خط لکھتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

> ''اگر میں عنفوانِ شباب میں وہاں گیا ہوتا اور شادی خانہ داری کی ذمہ داریاں
> میری راہ میں حائل نہ ہوتیں تو موت العمر کے لیے کلکتے میں ہی رہ جاتا۔''

(سورج، لاہور، دوصد سالہ جشن غالبؔ، مدیر تسلیم احمد تصور، ص: ۱۳۷-۱۳۶)

غالبؔ جیسا ایک ذہین انسان موت کی آرزو کس انداز میں کرتا ہے اور مرنے کے لیے کس جگہ کا تعین کرتا ہے۔ مرنے کے لیے کسی جگہ کا انتخاب کرنا حقیقتاً اُس جگہ کی ایک الگ ہی مناسبت ہوگی۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی وہ یہ کہ کلکتہ ایک جدید شہر بن گیا تھا اور غالبؔ نئے کلکتہ سے متاثر ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کلکتہ کا ذکر غالبؔ نے نہایت حسین اور دلکش پیرائے میں کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کلکتے کا جو ذکر کیا، تو نے ہم نشین
اک تیر میرے سینے میں، مارا کہ ہائے ہائے

غالبؔ انگریزوں کے لائے ہوئے ڈاک کے نظام سے بے حد متاثر تھے۔ غالبؔ کے زمانے میں دو طرح کے نظامِ ڈاک کام کرتے تھے۔ ایک ''ہندوستانی ڈاک'' دوسرا ''انگریزی ڈاک'' ہندوستانی ڈاک مقامی لوگ چلاتے تھے، اُس کو چلانے کے لیے ٹھیکہ دار کام کرتے تھے۔ اس کے بجائے، انگریزی نظامِ ڈاک، مکمل طور پر انگریزوں کے ماتحت تھا، ملازم مقامی لوگ ہی تھے۔ مگر انگریزوں کے تحت ہونے کی وجہ سے، یہ نظام ڈاک زیادہ موثر اور مکمل تھا۔ اس نظام ڈاک کی یہ خصوصیت ہوتی تھی، نہ ہی خط ضائع ہوتا تھا اور نہ ہی خطوط کے پہنچنے میں زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ غالبؔ کو کلکتے کے سفر کے دوران انگریزی ڈاک کی خوبیوں کا بار بار تجربہ ہوا، یہی وجہ ہے، وہ عموماً اپنے خطوط میں انگریزی ڈاک سے مستفید ہونے کی کہہ رہے تھے اور ہندوستانی نظام ڈاک کی

خرابیوں اور بُرائیوں کی طرف دھیان دلاتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستانی نظام ڈاک، سُست رفتاری اور پُرانے طریقوں پر رائج تھا۔ اس کے بجائے، انگریزی نظام ڈاک، نئے نئے طریقوں اور نئے طرز عمل کے تحت کام کر رہا تھا۔ ڈاک کی ان خوبیوں اور خرابیوں کا ذکر وہ اپنے فارسی خطوط میں اکثر و بیشتر کچھ کیا کرتے تھے۔ ایک جگہ ہندوستانی ڈاک کی نااستواری کا ذکر اور آئندہ کیلئے لائحہ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہر دو بار نامہ در ڈاک ہندوستانی فرستادستم وایں سررشتہ را آں مایہ استواری
> نیست کہ دل بداں تواں بست۔ لاجرم در رسیدن آں عرائض دو دل بودم۔
> اکنوں۔....... عہد کردم کہ ازیں بعد نامہ جز در ڈاک انگریزی نفرستم۔''

(پنج آہنگ، مرتبہ کالی داس گپتا رضا، ص: ۱۱۳)

اس بیان سے پتہ چلا کہ وہ ہندوستانی ڈاک کی نااہلی اور لاپروائیوں سے تنگ آ چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستانی ڈاک کی کُھل کر مخالفت کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے اکثر خطوط ہندوستانی ڈاک کے ذریعے ضائع ہو چکے تھے اور دوسرا یہ کہ اگر اس کے ذریعے خط مکتوب الیہ تک پہنچتا بھی، تو بڑی دیر کے بعد، اس کے بجائے انگریزی ڈاک موثر اور کارآمد اور ایک جدید ڈاک سروس تھی۔ یہ نظامِ ڈاک، خطوط کو ضائع ہونے نہیں دیتی اور جلدی سے مکتوب الیہ تک خط کو پہنچا دیتی، جو آج کے زمانے کے مقابلے میں بھی کارآمد اور موثر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ غالبؔ مغرب سے متاثر تھے۔ کلکتے میں آئی ہوئی مغرب کی نئی ہوا، جس میں نیا نظام صنعت، کاروبار کے نئے طریقے، ڈاک کا نیا نظام، روشنی کا نیا اور متبادل نظام، صاف ستھری اور بڑی بڑی سڑکیں، فن تعمیر کے نئے طریقے، صحافت کا ایک نیا نظام، پریس کا آغاز وغیرہ، یہ وہ نئی مصنوعات تھیں، جنھوں نے غالبؔ کو بے حد متاثر کیا اور یہی وجہ ہے کہ اس کا اظہار غالبؔ نے، اس وقت کُھل کر کیا۔

بالآخر ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو غالب کلکتہ سے واپس دہلی آئے۔ دہلی میں مرزا غالبؔ کو سخت معاشی قحط اور بدترین مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ غالب خط افلاس سے نیچے کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ قرض کے بوجھ تلے دب چکے تھے۔ ان کو اس شدید اور بھیانک صورت حال میں ۱۸۴۰ء دہلی کالج میں استاد کی حیثیت سے مدعو کیا گیا لیکن مرزا اس قدر عزت نفس اور خودی کو اہمیت دیتے تھے کہ یہ کہہ کر نوکری ٹھکرا دی کہ وہاں ان کے استقبال کے لیے کوئی شخص موجود نہ تھا۔

جب سر سید احمد خان نے ''آئین اکبری'' ترتیب دی، جو کہ دراصل جلال الدین محمد اکبر کے زمانے میں ابوالفضل نے لکھی تھی، اس کتاب میں اس زمانے کے دستور، قوانین، شرح محصولات، لگان اور اشیا و اجناس کے مقرر کردہ نرخ وغیرہ تھے۔ سر سید احمد خان نے اس کتاب کی تصحیح کی اور اس پر حواشی کے اضافے کے بعد اسے دوبارہ

چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے انہوں مرزا غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی درخواست کی۔ اس بابت سرسید کا شاید یہ خیال تھا کہ غالب اس کارنامے پر ان کی ستائش کریں گے، لیکن انھوں نے اس کے برعکس اپنی تقریظ میں ایک الگ ہی پیغام بھیجا اور وہ کچھ لکھ دیا جو اس زمانے کے ادیبوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ شاید غالبؔ کو زمانے کے بدلتے ہوئے انداز کو دیکھ کر بھی اچھا نہیں لگا ہوگا کہ وہ اُس کی تقریظ لکھے، جس کی اُس وقت ضرورت ہی نہیں تھی اور شاید غالب کی نظر میں سرسید کا مقام اعلیٰ و ارفع رہا ہوگا، چوں کہ سرسید ایک نام کما چکے تھے، اس لیے غالب کی توقعات سرسید سے کچھ اور ہی ہوں گی، یا ہوسکتا ہے غالب کو اس بات کا علم ہوا ہوگا کہ سرسید نے اس کام کے لیے انگریزی حکومت سے وظیفہ بھی واگذار کرایا تھا اور مسٹر بلاکمین نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کا کام بھی اپنے ذمہ لیا تھا۔ شاید غالب کو اس خدشہ نے پریشاں کیا ہوگا کہ انگریز سرسید کو ایسے کاموں میں مشغول رکھنا چاہتے ہیں جسے کوئی اور بھی بہ آسانی انجام دے سکتا ہے اور شاید غالب اُس وقت سرسید سے کوئی اہم کام چاہتے تھے جس کا ذکر پھر اس نے تقریظ میں واشگاف الفاظ میں کرتے ہوئے اپنے شعور اور بیدار مغز ہونے کا ثبوت بھی پیش کیا۔ اس کے باوجود کہ غالب اور سید احمد خان کے خاندانی روابط تھے اور سرسید مرزا غالب کو ادب سے چچا بھی کہتے تھے، غالب نے ان تمام باتوں کو یکسر مسترد کر کے اپنی حکمتِ عملی سے حکیمانہ طرز انداز اختیار کیا۔ حالاں کہ اُس وقت سرسید کو یہ تقریظ پسند نہ آئی اور نہ ہی انہوں نے اس کو مذکورہ کتاب میں تقریظ کی حیثیت سے شامل کیا، لیکن ہوسکتا ہے غدر کے بعد سرسید کو غالب کی اسی تقریظ نے سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ تحریک کی تحریک دی ہوگی۔ کیوں کہ غالب نے پہلے ہی فرمایا تھا کہ ہمیں انگریزوں کا مقابلہ جوش سے نہیں علم سے کرنا ہوگا۔

اگرچہ ایک طرف غالب حکیمانہ سوچ کے مالک تھے، لیکن دوسری طرف بری عادتوں کے بھی مالک تھے اور ان بری عادتوں میں شراب کے ساتھ ساتھ شطرنج، جوا وغیرہ بھی کھیلتے تھے۔ غالبؔ کی شخصیت کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اوائل عمر سے ہی جوا اور چوسر کھیلنے کے عادی تھے۔ ۱۸۴۱ء کو غالب پہلی بار اس جرم کی پاداش میں جیل بھی گئے۔ ان پر سو روپے جرمانہ بھی عائد ہوا۔ معاشی پسماندگی کے سبب جرمانہ ادا نہ کر سکے اور چار ماہ کی قید کی مزید سزا سنائی گئی۔ غالبؔ کو ۲۵ دسمبر ۱۸۴۷ء کو دوبارہ اسی جرم کی پاداش میں چھ ماہ قید اور دو سو روپے جرمانہ عائد ہوا اس بار مجسٹریٹ کے اثر و رسوخ اور احباب کی سفارش سے صرف تین ماہ جیل میں گزارنے کے بعد رہا ہوئے۔

غالبؔ کی زندگی میں حالات نے اس وقت کروٹ بدلی جب کالے صاحب اور حکیم احسن اللہ خان کی سفارش سے غالبؔ کا تعلق بہادر شاہ ظفر سے قائم ہوا۔ بہادر شاہ ظفر کے استاد شیخ ابراہیم ذوق تھے، لیکن ۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء کو ذوق کا انتقال ہوا اور غالبؔ کو بہادر شاہ ظفر کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔ بہادر شاہ ظفر نے غالبؔ کو یہ ذمہ داری عائد کی کہ خاندان تیموری کی تاریخ قلم بند کریں۔ غالب کا چھ سو روپے سالانہ مشاہرہ تفویض ہوا۔ ابوالکلام

قاسمی نے الطاف حسین کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ ’’جب مرزا غالبؔ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس موقع پر انہیں نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کہہ کر خطاب کیا اور رسمی طور پر چھے پارچے اور خلعت سے سرفراز کیا۔ اس موقع پر پچاس روپے ماہانہ ان کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔‘‘ غالبؔ کی زندگی کو یہ اعزاز واکرام زیادہ دیر حاصل نہیں رہ سکا کیوں کہ ان کی زندگی کو ابھی ایک اور طوفان دیکھنا تھا۔ ۲۰ دسمبر ۱۸۵۷ء کو انگریز ہندوستان پر مسلط ہو گئے اور اس بغاوت نامی انتشار نے ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیا۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لیے گئے۔ غالبؔ کے مقدر کو ایک بار پھر گرہن لگ گیا۔ انہوں نے اتنی صعوبتوں اور اذیتوں کے بعد بھی حوصلہ نہیں ہارا، بلکہ شعر و ادب سے خود کو وابستہ رکھا۔ اس ہنگامہ خیز صورت حال میں انہوں نے ’’دستنبو‘‘ لکھی، جو ۱۸۵۸ء کو شائع ہوئی۔ ۱۸۶۲ء کے اوائل میں فارسی کی معروف لغت برہان قاطع کی غلطیاں نشان زد کیں اور ’’قاطع برہان‘‘ کے نام سے اپنی کتاب کو منظر عام پر لائے۔ اس حوالے سے مالک رام اپنی کتاب ’’ذکر غالب‘‘ میں یوں رقمطراز ہیں:

> ’’یہ ایام میرزا پر بھی نہایت مصیبت کے گزرے آمدنی بالکل مفقود اور خرچ بدستور۔ بارے ان کے بعض ہندو دوستوں نے اس زمانے میں ان کی خبر گیری کی۔ ہرگوپال تفتہؔ میرٹھ سے روپیہ بھیجا کیے، مہیش داس انھیں شراب مہیا کرتے رہے۔ ان کے علاوہ منشی ہیرا سنگھ پنڈت شیو جی رام اور ان کے لڑکے بال مکند نے بھی حتی الوسیع ان کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ میرزا نے دستنبو میں ان سب کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں نے ان حضرات کا ذکر اس لیے کیا کہ جہاں ان کی عنایتوں کا شکریہ مجھ پر واجب تھا وہیں میں چاہتا ہوں کہ میرے دوسرے دوستوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ میرے جیسا کثیر الاحباب شخص اس زمانے میں کیسے بسر کرتا رہا۔ اگر شہر میں یہ چاروں صاحب بھی موجود نہ ہوتے تو کوئی میری بے کسی کا گواہ تک نہ ہوتا۔‘‘

(ذکر غالب، مالک رام، ص: ۷۲-۷۱)

نواب رام پور یوسف علی خان ناظم سے غالبؔ کے اچھے مراسم تھے۔ غالبؔ نے نواب کی مدح میں ایک قصیدہ بھی بھیجا جسے انہوں نے کافی پسند فرمایا۔ ۱۷ جنوری ۱۸۶۰ء کو مرزا غالبؔ نے رامپور کا پہلا سفر کیا تھا لیکن یہاں دو ماہ سے زیادہ قیام نہیں کیا اور واپس دلی روانہ ہوئے۔ دوسری دفعہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو اس وقت رامپور گئے جب نواب یوسف علی خاں کے بعد ان کے فرزند نواب کلب علی خان مسند نشین ہوئے۔ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو واپس دلی لوٹ رہے تھے کہ دریائے رام گڑھ میں تند و تیز سیلاب اور پل بہہ جانے کی وجہ سے شدید مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ شدید بخار اور سردی کی وجہ سے غالبؔ کے پورے اعصاب میں درد سرایت کر گیا اور پورا جسم جواب دینے لگا۔

غالبؔ کے آخری ایام کی تصویر کشی ڈاکٹر خلیق انجم نے یوں پیش کی ہے:

> ’’آج کتنے عرصے بعد ہم غالبؔ کے دیوان خانے میں آئے، ہے وہی غالبؔ، وہی احباب اور وہی شاگرد لیکن محفل کی باغ و بہار، فضا کو کیا ہو، اوہ شگفتگی کیا ہوئی، ہر چہرے پر گہری اداسی کیوں؟ بات یہ ہے کہ جس کے دم سے محفل میں رونق تھی وہ صاحب فراش ہے۔ اب غالبؔ اٹھ سکتے ہیں نہ بیٹھ سکتے ہیں۔ کسی نے لکھ کر خیریت پوچھی تو رک کر جواب دے دیتے ہیں۔ سامعہ مر گیا تھا آب بادہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں، سب مضمحل ہیں۔
>
> غالبؔ خاموش لیٹے ہیں کبھی کبھی اپنا ایک مصرع:
>
> اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے
>
> پڑھ لیتے ہیں۔‘‘

آخر کار ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اردو شاعری کا یہ شمس ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا اور حضرت نظام الدین اولیا کے قرب میں موجود قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

19.3.2 ماحصل

عزیز طلبا! مذکورہ گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ غالب ایک اعلیٰ خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، جس پر غالب کو ناز تھا تھا۔ غالب اگرچہ بچپن میں یتیم ہو گئے تھے لیکن ان کی پرورش و پرداخت ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے عمدہ اور شاہانہ طور پر کی اور ان کی تعلیم و تربیت بھی اعلیٰ سطح سے کی گئی۔ غالب کے ابتدائی دور تو بڑی فراوانی میں گزرے۔ لیکن بعد میں ان کی زندگی بڑے پیچیدہ مسائل اور نا مساعد حالات میں گھر گئی، لیکن انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری، بلکہ اپنی حکمت اور بصیرت سے ظاہری طرز زندگی کو منظّم اور مہتم رکھا۔ علما، ادبا، روسا، نوابین، اراکین سلطنت اور ہر طبقے سے خاص رسوخ رکھنے کی وجہ سے ان کی زندگی باعث تسکین بنی۔ نسبی پاس ولحاظ ہمیشہ ان کی شخصیت سازی کا حصہ رہا۔ انھوں نے ایک تہذیب کو مٹتے اور دوسری تہذیب کے تسلط کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ شکست و ریخت، سیاسی اتھل پتھل، سماجی، ثقافتی اور تمدنی انحطاط و زوال اور ظلم و ستم کے مناظر نے ان کی شخصیت سازی میں اہم رول ادا کیا۔ جس کی وجہ سے وہ بہت سخت جان واقع ہوئے۔ خودداری، سخاوت اور شوخی ان کی سرشت میں شامل تھی۔ الغرض یہ کہ مرزا اسد اللہ خاں کے خاندانی اور معاشرتی حالات و حادثات نے انھیں زمانہ کا غالب بنا دیا۔

19.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- غالبؔ کے خاندانی پس منظر سے واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کی تعلیم و تربیت اور ازدواجی زندگی کی جانکاری حاصل کی۔
- غالبؔ کی عادات و اطوار اور کردار کی معلومات حاصل کی۔
- غالبؔ کی زندگی سے وابستہ سماجی اور سیاسی مسائل کا ادراک کیا۔
- غالبؔ کی زندگی کے معاشی مسائل اور نا مساعد حالات سے آگہی حاصل کی۔

19.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ تخلص اسدؔ کے حوالے سے غالبؔ کا واقعہ بیان کیجیے۔

۲۔ غالبؔ کے خاندانی پس منظر کو مختصراً بیان کیجیے۔

۳۔ غالبؔ نے ابتدائی تعلیم کن اساتذہ سے حاصل کی؟ تحریر کیجیے۔

۴۔ غالبؔ کے دور میں انگریزوں کا لایا ہوا ڈاک نظام کیسا تھا؟ روشنی ڈالیے۔

۵۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار سے غالب کی رسائی کس کی سفارش پر ہوئی اور انہیں کون سی مراعات حاصل ہوئیں؟ مختصراً تحریر کیجیے۔

19.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ ان کے تخلص کے حوالے سے یہ قصہ بھی مشہور ہے کہ کسی نے میر امانی اسد کے شعر کو تخلص کی بنیاد پر غالب کا شعر سمجھ کر شعر سے لطف اندوز ہو کر داد دی اور غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا جناب مجھے آپ کا یہ شعر بہت پسند آیا، تو انہوں نے کہا کہ میرا کون سا شعر آپ کو پسند ہے، ذرا شعر پڑھیں، تو انہوں نے غالب کو میر امانی اسد کا یہ شعر سنایا: ''اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی - میرے شیر شاباش رحمت خدا کی'' یہ شعر سنتے ہی غالب کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے جواب میں کہا کہ ''حضرت اگر یہ کسی اور اسدؔ کا شعر ہے تو اس پر رحمت خدا کی اور اگر یہ مجھ اسدؔ کا ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی'' اور اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ اسد نامی تخلص کو ہی خیر باد کہا اور اپنا تخلص غالبؔ رکھا اور اسی تخلص سے پوری دنیا میں مشہور و معروف ہوئے۔

۲۔ غالب کے خاندان کا پس منظر یہ ہے کہ مرزا غالب کے پردادا کا اسم گرامی مرزا قوقان بیگ تھا۔ جن کی پشتینی وابستگی ترک قوم سے تھی اور ان کا نسبی انضمام توران ابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ جب تورانیوں کا جاہ وجلال کیانیوں کے عروج واقبال کی آندھی میں غبار کی طرح اڑ گیا تو حکمران خاندان کے باقی ماندہ افراد اپنے وطن کو چھوڑ کر منتشر ہوگئے۔ تاریخ نے پھر کروٹ بدلی اور اسلامی عہد میں اس خاندان نے اپنی منظّم کوششوں سے ایک مہتم بالشان سلطنت کی داغ بیل ڈالی جسے تاریخ میں سلجوقی سلطنت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس عظیم الشان سلطنت کے سورج کو بھی جب گرہن لگا تو سلطنت سے منسلک افراد مخلوق الحالی اور پسماندگی کا شکار ہوگئے۔ ان ہی میں ایک کا نام شہزادہ ترسم خان تھا جو سمرقند میں جا بسا۔ غالبؔ اسی ترسم خان کی اولاد میں سے تھے۔ غالبؔ کے پردادا مرزا قوقان بیگ پہلے لاہور میں نواب معین الملک بہادر کی ملازمت میں داخل ہوئے پھر معین الملک کی وفات پر لاہور سے دہلی پہنچے اور نواب ذوالفقارالدولہ میر نجف خان بہادر کے نظام حکومت سے وابستہ ہوگئے۔ لیکن جلد ہی یہاں سے مستعفی ہونے کے بعد انہوں نے مہاراجہ جے پور کے یہاں خدمات انجام دی اور آگرہ کو اپنا مسکن بنایا۔ قوقان بیگ کی شادی ۱۷۶۳ء میں ہوئی اور ان کی اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں جن میں صرف ان کے دو صاحبزادوں کا نام محفوظ ہے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان اور مرزا نصراللہ بیگ خان۔ مرزا عبداللہ بیگ خان غالبؔ کے والد تھے۔

۳۔ غالبؔ نے آگرے میں مولوی محمد اعظم سے تعلیم حاصل کی۔ غالبؔ نے فارسی زبان وادب کے اسرار و غوامض ملا عبدالصمد سے حاصل کیے (یادگار غالب، ص:۲۰) جس کا ثبوت غالبؔ کی تصانیف ”لطائف غیبی“ اور ”درفش کاویانی“ سے ملتا ہے کہ ملا عبدالصمد سے شرف تلمذ کے وقت غالب کی عمر چودہ برس کی تھی، اس طرح انھوں نے ابتدائی زمانے میں ہی فارسی شعر وسخن کا اعلیٰ ذوق پیدا کر لیا تھا۔

۴۔ غالبؔ انگریزوں کے لائے ہوئے ڈاک کے نظام سے بے حد متاثر تھے۔ غالبؔ کے زمانے میں دو طرح کے نظامِ ڈاک کام کرتے تھے۔ ایک ”ہندوستانی ڈاک“ دوسرا ”انگریزی ڈاک“ ہندوستانی ڈاک مقامی لوگ چلاتے تھے، اُس کو چلانے کے لیے ٹھیکہ دار کام کرتے تھے۔ اس کے بجائے، انگریزی نظامِ ڈاک مکمل طور پر انگریزوں کے ماتحت تھا، ملازم مقامی لوگ ہی تھے۔ مگر انگریزوں کے تحت ہونے کی وجہ سے، یہ نظام ڈاک زیادہ موثر اور مکمل تھا۔ اس نظام ڈاک کی یہ خصوصیت ہوتی تھی، نہ ہی خط ضائع ہوتا تھا اور نہ ہی خطوط کے پہنچنے میں زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ غالبؔ کو کلکتے کے سفر کے دوران انگریزی ڈاک کی خوبیوں کا بار بار تجربہ ہوا، یہی وجہ ہے، وہ عموماً اپنے خطوط میں انگریزی ڈاک سے مستفید ہونے کی کہہ رہے تھے اور ہندوستانی نظام ڈاک کی خرابیوں اور بُرائیوں کی طرف دھیان دلاتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستانی نظام ڈاک، سُست رفتاری اور پُرانے

طریقوں پر رائج تھا۔ اس کے بجائے، انگریزی نظام ڈاک، نئے نئے طریقوں اور نئے طرزِ عمل کے تحت کام کر رہا تھا۔ ڈاک کی ان خوبیوں اور خرابیوں کا ذکر وہ اپنے فارسی خطوط میں اکثر و بیشتر کچھ کیا کرتے تھے۔

۵۔ کالے صاحب اور حکیم احسن اللہ خان کی سفارش سے غالبؔ کا تعلق بہادر شاہ ظفر سے قائم ہوا۔ بہادر شاہ ظفر کے استاد شیخ ابراہیم ذوق تھے، لیکن ۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء کو ذوق کا انتقال ہوا اور غالبؔ کو بہادر شاہ ظفر کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔ بہادر شاہ ظفر نے غالبؔ کو یہ ذمہ داری عائد کی کہ خاندان تیموری کی تاریخ قلم بند کریں۔ غالب کا چھ سو روپے سالانہ مشاہرہ تفویض ہوا۔ ابوالکلام قاسمی نے الطاف حسین کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جب مرزا غالبؔ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس موقع پر انہیں نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کہہ کر خطاب کیا اور رسمی طور پر چھے پارچے اور خلعت سے سرفراز کیا۔ اس موقع پر پچاس روپے ماہانہ ان کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔'' غالبؔ کی زندگی کو یہ اعزاز و اکرام زیادہ دیر حاصل نہیں رہ سکا کیوں کہ ان کی زندگی کو ابھی ایک اور طوفان دیکھنا تھا۔ ۲۰ دسمبر ۱۸۵۷ء کو انگریز ہندوستان پر مسلط ہو گئے اور اس بغاوت نامی انتشار نے ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیا۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لیے گئے۔

19.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
تقلیب	:	الٹ پلٹ، تغیر و تبدل
تازہ دم	:	چست، چاق و چوبند
انارکی	:	انتشار، لاقانونیت
پشتینی	:	موروثی، باپ دادا سے منسوب
نابغہ روزگار	:	اپنے زمانے کا سب سے ذہین و فطین
مہتم بالشان	:	شاندار، عظیم
منابع	:	نکلنے کی جگہ، سوتے
پژمردہ	:	افسردہ، مرجھایا ہوا
سانحہ ارتحال	:	وفات پا جانے کا حادثہ
سامراج	:	ملوکیت کا نظام، وہ نظام حکومت جو نو آبادیات پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے قائم کیا جائے

مخاصمت	دشمنی، عداوت، مخالفت
ارتسام	نقش، پرتو، اثر
ہبوط	نیچے اترنا، زوال
امتداد زمانہ	طویل زمانہ، مدت کے بعد
افراط	کثرت، فراوانی
قابل تعزیر	قابل سزا
مشاہرہ	ماہانہ تنخواہ، مقررہ وظیفہ

19.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	یادگار غالب	الطاف حسین حالی
۲۔	ذکر غالب	مالک رام
۳۔	غالب کے خطوط	خلیق انجم
۴۔	شرح دیوان غالب	یوسف سلیم چشتی
۵۔	جہان غالب	قاضی عبدالودود
۶۔	تلاش غالب	نثار احمد فاروقی

اکائی 20 غالبؔ اور پنشن کا قضیہ

ساخت

20.1 اغراض و مقاصد
20.2 تمہید
20.3 غالبؔ اور پنشن کا قضیہ
  20.3.1 غالبؔ کی پنشن کا پس منظر
  20.3.2 قضیہ کے اسباب اور غالبؔ کی ابتدائی کوششیں
  20.3.3 غالبؔ کا سفر کلکتہ
  20.3.4 تقسیم پنشن پر غالبؔ کے اعتراضات اور فریق مخالف کا جواب
  20.3.5 مقدمے کی پیروی
  20.3.6 ماحصل
20.4 آپ نے کیا سیکھا؟
20.5 اپنا امتحان خود لیجیے
20.6 سوالوں کے جوابات
20.7 فرہنگ
20.8 کتب برائے مطالعہ

20.1 اغراض و مقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- غالبؔ کی پنشن کے پس منظر سے واقف ہوں گے۔
- نصراللہ بیگ کے پس ماندگان کی پرورش و پرداخت کے لیے کسے کتنی پنشن دی گئی؟ سے روشناس ہوں گے۔
- پنشن سے متعلق غالبؔ کے مطالبات اور اعتراضات سے واقف ہوں گے۔
- غالبؔ کے سفر کلکتہ کی روداد سے متعارف ہوں گے۔
- مقدمے کی پیروی کے مراحل اور اس کے نتائج سے باخبر ہوں گے۔

20.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے غالب کے سوانحی حالات وکوائف کا مفصل مطالعہ کرکے ان کی سیرت و شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں غالب اور ان کی پنشن کے قضیہ کے متعلق تفصیل سے پڑھیں گے۔ آپ یہ جانتے ہوں گے کہ نصر اللہ بیگ غالب کے چچا تھے، جن کی جائداد سے انھیں پنشن ملتی تھی۔ غالبؔ کے پنشن کا قضیہ ان کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی محققین کے لیے ایک مشکل امر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنشن کے بارے میں متضاد شہادتوں کا ہونا اور اس قضیہ کے متعلق خود غالبؔ کی تحریروں میں مختلف بیانات کا ملنا محققین و ناقدین کے لیے پیچیدہ مسئلہ بن گیا۔ غالبؔ نے اپنی پنشن کے لیے کلکتہ کا ایک طویل سفر بھی طے کیا تھا۔ اس سفر میں غالب کے ساتھ بہت سے تاریخی واقعات اور ادبی معرکے رونما ہونے کی وجہ سے یہ موضوع نہایت اہمیت کا حامل ہوگیا۔ لہٰذا اس اکائی میں آپ ان کی پنشن کے قضیہ کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

20.3 غالبؔ اور پنشن کا قضیہ

20.3.1 غالبؔ کی پنشن کا پس منظر

غالبؔ کے دادا فوقان بیگ ۱۷۵۰ء کے آس پاس محمد شاہ کے زمانہ میں سمرقند سے دہلی آئے اور شاہی فوج میں ایک اہم عہدے پر فائز ہوئے۔ دادا کی تین اولادیں ہوئیں ایک لڑکی اور دو لڑکے عبداللہ بیگ خاں اور نصر اللہ بیگ خاں۔ اول الذکر عبداللہ بیگ خاں غالبؔ کے والد گرامی ہیں۔ جن کا انتقال ۱۸۰۲ء میں ہوا۔ اس وقت غالبؔ کی عمر محض پانچ سال تھی۔ غالب کے والد والی الور راجہ راؤ کی فوج کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے تھے۔ اب غالبؔ کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے اپنے ذمہ لے لی۔ غالب کو دوسرا بڑا صدمہ اس وقت لگا جب ۱۸۹۶ء میں والد کے انتقال کے محض تین سال بعد ان کے چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔ چچا نصر اللہ بیگ آگرہ قلعہ کے قلعہ دار تھے۔ جب انگریزوں نے لارڈ لیک کی سربراہی میں آگرہ کی طرف پیش قدمی کی تو نصر اللہ بیگ نے قلعہ کو انگریزوں کے حوالے کردیا۔ اس سے خوش ہوکر انگریزوں نے ان کو عہدے پر برقرار رکھا۔ بعد میں اس کی پاداش میں ''سونک'' اور ''سونسا'' نام کے دو پرگنے انہیں دیے گئے۔ نصر اللہ بیگ کی بیوی اور بچے کا انتقال ان کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا، اس لیے انگریزی سرکار نے ان کی جاگیر ضبط کرکے ان کے ورثا کے لیے پنشن مقرر کردی۔ نصر اللہ بیگ کے برادر نسبتی (سالے) نواب احمد بخش کو انگریزی سرکار کی طرف سے فیروز پور جھرکہ کا علاقہ دیا گیا۔ سرکار نے نواب احمد بخش کے ۲۵ ہزار روپے سالانہ اس شرط پر معاف کردیے کہ وہ ۵۰ سواروں کے دستے بہ وقت ضرورت انگریزی سرکار کی مدد کے لیے تیار رکھیں گے اور نصر اللہ بیگ کے پس ماندگان کی پرورش و

پرداخت کرتے رہیں گے۔ پرورش و پرداخت کے لیے پنشن کی تقسیم اس طرح ہوئی:

- خواجہ حاجی کو دو ہزار روپئے سالانہ
- نصر اللہ بیگ کی والدہ اور اور تین بہنوں کو ڈیڑھ ہزار روپئے سالانہ
- غالبؔ اور ان کے بھائی مرزا یوسف کو ڈیڑھ ہزار روپئے سالانہ

غالبؔ کو جو وظیفہ ملتا تھا اس میں سے وہ اپنے بھائی مرزا یوسف کو آدھی رقم سالانہ دیتے تھے۔ بعد میں ان کی بیوی کی شکایت پر سرکار نے اس رقم سے چار سو روپئے ان کی بیوی کے لیے مقرر کر دیے۔

مالک رام کے مطابق آگرے میں غالب کو ''کوئی تنگی نہ تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روپئے پیسے کی افراط تھی۔'' دہلی منتقلی کے بعد پنشن کی رقم سے گزر بسر ہو جاتا تھا، لیکن دھیرے دھیرے آمدنی اور خرچ کا توازن غالبؔ کے شاہانہ خرچ کی وجہ سے بگڑتا گیا۔

20.3.2 قضیہ کے اسباب اور غالبؔ کی ابتدائی کوششیں

غالبؔ ۱۸۲۶ء تک فیروز پور جھرکہ سے اپنی پنشن وصول کرتے رہے۔ ملک حسن اختر نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ غالبؔ اپنے خسر (سسر) کی زندگی تک پنشن کے معاملے پر خاموش کیوں تھے۔ ممکن ہے کہ غالبؔ کے سسر نے نواب احمد بخش سے پنشن کے متعلق کوئی نزاعی معاملہ پیدا نہ ہو، اس لیے ان کو روک رکھا ہو، کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ اس سے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ غالبؔ نے نواب احمد بخش کے سامنے پنشن کا معاملہ اس وقت اٹھایا جب ان کے سسر اور نواب احمد بخش کے بھائی نواب الٰہی کا ۱۸۲۶ء میں انتقال ہو گیا۔ غالبؔ کا کہنا یہ تھا کہ نواب احمد بخش نے اپنی مرضی سے خواجہ حاجی کو اس میں شامل کیا ہے۔ اس میں انگریز سرکار کی مرضی کا دخل نہیں ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ خواجہ حاجی کسی طریقے سے نصر اللہ بیگ کے رشتہ داروں میں نہیں آتے ہیں، لہٰذا ان کو رشتہ داروں میں شمار کر کے وظیفہ کی ایک بڑی رقم دینے کی وجہ سے نصر اللہ بیگ کے حقیقی ورثا کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ غالبؔ نے اس مسئلہ پر جو خط انگریزی حکومت کے پاس بھیجا تھا اس کے مطابق انہوں نے کلکتہ جانے سے پہلے کئی مرتبہ اس ناانصافی کی شکایت نواب احمد بخش سے کی تھی اور ان سے اس ناانصافی کے ازالہ کے لیے بھی کہا تھا۔ نواب صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد وظیفے کی رقم ان کے حقیقی ورثا میں تقسیم کر دی جائے گی۔ جب خواجہ حاجی کا انتقال ہوا تو ان کا وعدہ یاد دلانے کے لیے غالب ایک بار پھر فیروز پور گئے، لیکن نواب صاحب نے اپنی بعض مجبوریوں کا حوالہ دیا اور کہا کہ ریزیڈنٹ دہلی اختر لونی سے ابھی تعلقات کشیدہ ہیں، اس لیے حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کریں۔ ۱۸۲۵ء میں جب جنرل لونی کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ سر چارلس مٹکاف ریزیڈنٹ مقرر ہوئے۔ بھرت پور کے راجہ کی مدد کے لیے مٹکاف کو بھرت پور جانا ہوا تو غالبؔ اس امید میں نواب صاحب کے ساتھ بھرت پور گئے کہ وہ ان کا تعارف مٹکاف سے کرا دیں

گے۔ وہ تین دنوں تک فیروز پور میں رہے، لیکن نواب صاحب نے مٹکاف سے ان کا تعارف نہیں کرایا۔ اب غالبؔ نواب صاحب سے مایوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا قضیہ خود مٹکاف کے سامنے رکھیں گے۔ پنشن کے لیے غالبؔ کی جدوجہد کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ نواب گورنر جنرل بہادر دہلی آرہے ہیں، انہیں کہیں سے خبر ملی کہ مٹکاف ان کے استقبال کے لیے کانپور جاسکتے ہیں تو انہوں نے اس امید میں کانپور کا سفر کیا کہ کانپور میں یا واپسی میں اگر راستے میں موقع ملا تو مٹکاف سے اپنے احوال بیان کردیں گے۔

غالب کی بدقسمتی دیکھیے کہ کانپور پہنچ کر وہ ایسے بیمار ہوئے کہ ان کے لیے بستر سے اٹھنا محال ہوگیا۔ ایسے میں وہ کیا کرسکتے تھے۔ بغرض علاج لکھنؤ گئے۔ ۲۰ نومبر ۱۸۲۶ء کو بادشاہ اودھ کی گورنر جنرل سے ملاقات کے وقت وہ لکھنؤ میں ہی صاحب فراش تھے۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریباً پانچ ماہ لکھنؤ میں رہے۔ غالبؔ کے بزرگوں کے نواب باندہ سے پرانے تعلقات تھے۔ چنانچہ وہ باندہ چلے گئے جہاں تقریباً چھ مہینے رہے۔ حنیف نقوی کے مطابق یہ مدت زیادہ سے زیادہ تین مہینہ رہی ہوگی۔ اس درمیان نواب بہادر جنرل بھی کلکتہ واپس چلے گئے۔

20.3.3 غالبؔ کا سفر کلکتہ

غالبؔ قرض خواہوں کے خوف سے واپس دہلی نہیں جانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح پنشن کا مسئلہ حل ہوجائے پھر دہلی واپس جائیں۔ انہیں ایک راستہ نظر آیا کہ کسی طرح انگریزی حکومت کے دارالخلافہ میں حاضری دے کر سرکار عالیہ میں درخواست دی جائے۔ غالب خشکی کے راستے بنارس ہوتے ہوئے گھوڑے کی سواری سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے۔ بنارس سے کلکتہ روانہ ہونے کی تاریخ ۲۷ دسمبر ۱۸۲۷ء ہے۔ مرشدآباد میں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ نواب احمد بخش کا انتقال ہوگیا ہے اور ان کے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں جانشین بنے ہیں۔ غالب کا دعوی چوں کہ نصراللہ بیگ کی جائداد سے ملنے والی پنشن پر تھا، اس وجہ سے انہوں نے سوچا کہ نواب احمد بخش ہوں یا نواب شمس الدین، اس سے ان کے پنشن کے قضیے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا وہ بغیر رکے کلکتہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ ترپین (۵۳) دن کا طویل سفر طے کرکے ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ غالبؔ ڈیڑھ سال یعنی ۱۴ اگست ۱۸۲۹ء تک کلکتہ میں مقیم رہے۔ اس درمیان اپنے مقدمے کی پیروی کے ساتھ ادبی معرکے پر بھی انہیں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

کلکتہ میں غالبؔ کے کئی ایسے دوست بنے جن سے زندگی کے آخری ایام تک ان کی خط وکتابت رہی۔ کلکتہ سے جانے کے بعد بھی وہ برابر کلکتہ کو یاد کرتے تھے جس کی ایک جھلک ان اشعار میں ملتی ہے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

20.3.4 تقسیم پنشن پر غالبؔ کے اعتراضات اور فریق مخالف کا جواب

غالبؔ کو جو پنشن مل رہی تھی اس کے تعلق سے بنیادی طور پر انہیں دو شکایتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ نواب احمد بخش نے سرکار کی ایما کے خلاف مجموعی پنشن کی رقم دس ہزار سے گھٹا کر پانچ ہزار کر دی ہے۔ دوسری شکایت یہ تھی خواجہ حاجی کا تعلق نصر اللہ بیگ کے خاندان سے نہیں تھا، اس لحاظ سے وہ نصر اللہ بیگ کے وارث نہیں بن سکتے تھے۔ اس کے باوجود نواب احمد بخش نے ان کو بھی ورثا میں شمار کر کے ان کا حصہ مقرر کر دیا۔ اس سلسلے میں سب سے مستند دستاویز خود غالبؔ کی تحریر ہے جو انہوں نے کلکتہ پہنچ کر ۲۸ مئی ۱۸۲۸ء کو سرکار کے پاس جمع کرائی تھی۔ اس خط کا اردو ترجمہ مالک رام کی کتاب فسانہ غالبؔ میں اور پرتھوی چندر کی کتاب ''جاگیر غالب'' موجود ہے۔ اس درخواست میں غالبؔ نے اپنی پنشن کے لیے نواب احمد بخش سے جو درخواستیں کی تھیں اس کی روداد بیان کی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے مطالبات کا بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ خواجہ حاجی کا تعلق نصر اللہ بیگ کے خاندان سے نہیں ہے۔ وہ نصر اللہ بیگ خان کے گھرانے کا ایک ملازم تھا۔ اس نے نصر اللہ بیگ کے سارے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا اور ستر اسی سواروں، ایک ہاتھی اور اسباب حرب کے ساتھ نصر اللہ بیگ کے سسر نواب احمد بخش خاں سے جاملا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سوائے اس کہ خواجہ حاجی کی والدہ نصر اللہ بیگ خاں کی ماں کی بہن یعنی خالہ کی بیٹی تھیں، ان میں اور نصر اللہ بیگ میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کو دیا جانے والا وظیفہ نصر اللہ بیگ کے حقیقی وارثین کے ساتھ ناانصافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بحیثیت مجموعی میں نہ تو احمد بخش خاں کی مقرر کی ہوئی رقم سے مطمئن ہوں اور نہ ان کے رقم کی تقسیم کے طریقہ کار سے اور اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتا کہ میں اپنے حقوق کسی اور کے ہاتھ سے وصول کروں اور نہ یہ برداشت کر سکتا

کہ ہوں کہ میرے ایک ادنی ملازم کو میرے برابر کھڑا کر دیا جائے۔''

(غالب کا سفر کلکتہ، خلیق انجم، ص: ۹۷-۹۸)

غالب نے حکومت کے سامنے مطالبات رکھے کہ حکومت نصر اللہ خاں کے وارثوں کا تعین خود کرے۔ ہر ایک وارث کو الگ الگ پنشن دی جائے اور غالب کو ان سب رشتہ داروں پر نگراں مقرر کیا جائے۔ انھوں نے حکومت سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ نواب احمد بخش نے جو رقم ان کے جائز وارثوں کو نہیں دی ہے اور سواروں کے دستے کو تحلیل کر کے جو رقم بچائی ہے اس کو ان سے واپس لیا جائے۔

نواب شمس الدین کی طرف سے پیش ہونے والے جواب میں غالب کے دعوے کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ غالب خواجہ حاجی کے وارثین کی حق تلفی کرنا چاہتے ہیں۔ خواجہ حاجی کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ان کا نام سرکار نے زیر کفالت افراد میں سب سے پہلے نمبر پر رکھا ہے۔ سند میں متوسلین کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا اطلاق رشتہ داروں دوستوں اور غیروں پر بھی ہوتا ہے، جن کا تعلق کسی دوسرے شخص سے ہو۔ خواجہ حاجی اس لحاظ سے نصر اللہ بیگ کے خصوصی متوسل ہیں اور دوسرے رشتے دار عمومی متوسل ہیں۔

غالب نے اپنی درخواست میں کچھ ایسی باتیں بھی لکھیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پورے معاملے سے وہ بے حد دل برداشتہ تھے، وہ لکھتے ہیں:

> ''میرا ارادہ ہے کہ اگر حکومت نے میرے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی تلافی کر دی اور میرے دعووں کی شنوائی کی تو بامراد و مطمئن اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ اور آرام سے زندگی بسر کروں گا اور اپنے غریب بھائی کے معالجے کی کوشش کروں گا اور اگر ارباب حکومت میرے مقدمہ میں تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کریں گے، تو میں یہاں سے جدھر منہ اٹھے گا چلا جاؤں گا۔ اپنے لباس کو تار تار کر دوں گا اور خاک چھانتا عرب اور دوسرے ممالک کے اجنبی شہروں میں ساری زندگی بھیک مانگ کر گزار دوں گا، کیوں کہ اس اعزاز کے ساتھ کہ حکومت سے میرے مراسم بڑے اچھے ہیں۔ میں ہندوستان میں کسی کے در پر بھیک مانگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

(غالب کا سفر کلکتہ، خلیق انجم، ص: ۹۷)

اس سلسلے میں جب نواب شمس الدین خاں سے وضاحت طلب کی گئی تو انھوں نے جواب میں کہا کہ سرکار نے جو

وظیفہ غالب کے لیے مقرر کیا ہے وہ ان کو برابر مل رہا ہے۔ غالبؔ کی درخواست کو مبالغہ آمیز قرار دیتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ وظیفہ میں اضافہ کا امکان اس لیے نہیں کہ ''انہیں نصر اللہ خاں مرحوم کے ورثا کے لیے جو رقم ملتی ہے، میں ان کو دے دیتا ہوں۔'' جہاں تک پچاس سواروں کی بات ہے تو انہیں نے اس کو اپنے اور حکومت کے درمیان کا معاملہ قرار دے کر کہا کہ ''اسد اللہ خاں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

20.3.5 مقدمے کی پیروی

کلکتے جانے سے پہلے غالب نے نواب باندہ سے نواب اکبر علی خاں کے لیے سفارشی خط لکھوا لیا تھا۔ غالبؔ یہ سفارشی خط لے کر نواب اکبر علی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ غالب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوا تھا کہ نواب صاحب کے تعلقات کلکٹر سے اچھے ہیں، لیکن نواب صاحب نے بتایا کہ اس وقت ان کے تعلقات کلکٹر سے اچھے نہیں ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اس سلسلے میں غالب کی ہر ممکن مدد کی۔ غالب کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں پر جو کچھ بھی کرنا ہے، خود سے کرنا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیا۔ انہیں خبر ملی کی گورنر جنرل کا دربار لگنے والا ہے۔ غالب دو دن پہلے منشی سے مل کر دربار میں شامل ہونے کی درخواست دی جو منظور کر لی گئی۔ گورنر جنرل نے فرداً فرداً سب سے ملاقات کی۔ غالب نے دو اشرفیاں نذرانے کے طور پر پیش کیں جو انہوں نے واپس کر دیا، لیکن انہیں کوئی خلعت نہیں ملی۔

گورنر جنرل کو بھیجی گئی ہر درخواست پہلے ولیم فریزر کے پاس پہنچتی تھی۔ اگر وہ درخواست لائق قبول ہوتی، تو اس کا ترجمہ کر کے صاحبان کونسل کی خدمت میں پیش کرتے تھے ورنہ رد کر دیا کرتے تھے۔ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ کو غالبؔ اپنی درخواست لے کر ولیم فریزر کے پاس پہنچے جو انہوں نے اپنے پاس رکھ لی۔ غالبؔ کے مطابق ولیم فریزر نے ان کی تعظیم و تکریم کے لیے عطر اور پان سے تواضع کی۔ کھڑے ہو کر سلام کیا۔ جس سے غالب کو اپنی مطلب برآوری کی امید بندھی۔ ایک اور انگریز افسر اسٹرلنگ کو غالب سے ہمدردی تھی۔ وہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں حکومت کے معتمد فارسی اور ڈپٹی سکریٹری تھے۔ غالب نے ان کی خدمت میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ انہوں نے اور ولیم فریزر نے غالبؔ سے کہا کہ انہیں قاعدے کے مطابق اپنی درخواست پہلے دہلی کے ریزیڈنٹ کے پاس جمع کرنی چاہیئے تھی۔ چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر درخواست اپنے پاس رکھ لی کہ آپ اپنی درخواست دہلی کے ریزیڈنٹ کے پاس جمع کرا دیں اور پھر وہ اسے کونسل کے پاس جمع کرا دیں گے۔ غالب نے طے کیا کہ وہ دہلی میں رہ کر ہی درخواست اپنے وکیل ہیرا لال کے توسط سے جمع کرائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ڈاک سے مختار نامہ اور ضروری کاغذات بھیج دیے۔ جس کو ان کے وکیل نے دہلی کے زیڈنٹ آفس میں جمع کرا دیے۔ ۱۷ اپریل ۱۸۲۹ء کو دہلی کے ریزیڈنٹ کا خط موصول ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ ان کی درخواست کو متعلقہ حکام تک پہنچا دی گئی ہے۔ غالبؔ نے گورنر جنرل سے ملاقات میں انہیں یہ خط دکھایا تو انہوں نے کہا کہ ریزیڈنٹ آپ پر نظر

عنایت رکھتے ہیں، وہ جلد ہی آپ کے دعوؤں کی تشخیص کر کے رپورٹ بھیجیں گے۔

اس درمیان غالب کو معلوم ہوا کہ گورنر جنرل قافلے کے ساتھ دہلی جا رہے ہیں۔ غالب نے سوچا کہ ریزیڈنٹ کی رپورٹ آنے میں دو تین ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔ اس لیے گورنر جنرل سے پہلے ہی دہلی پہنچ جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہیں پر کوئی بات بن جائے۔ اس مرتبہ غالب نے پانی کا راستہ اختیار کیا۔ غالب کی قسمت نے اس دفعہ بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ گورنر جنرل نے بنارس پہنچ کر اپنا ارادہ بدل دیا اور واپس کلکتہ چلے آئے۔

غالب جب دہلی پہنچے تو معلوم ہوا کہ بدعنوانی کے الزامات کی وجہ سے دہلی کے ریزیڈنٹ کو برطرف کر کے ان کی جگہ فرانسس ہاکنس کا تقرر کر دیا گیا ہے۔ غالب کے بقول وہ ایک علم دوست انسان تھے۔ غالب نے ہاکنس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ ہاکنس نے ایک گھنٹہ تک ان سے قصیدہ سنا اور کلکتے اور ان کے مقدمے کی بابت پوچھتے رہے۔

دہلی کے قائم مقام ریزیڈنٹ ایف ہاکنس نے گورنر جنرل کو اپنی ۵ مئی ۱۸۳۰ء کی رپورٹ میں غالب کی شکایت کو بے بنیاد قرار دے دیا۔ اس کے جواب میں چیف سکریٹری نے قائم مقام ریزیڈنٹ کو لکھا کہ گورنر جنرل آپ کی رائے سے متفق ہیں کہ غالب کی شکایت بے بنیاد ہے۔ غالب کے مطابق ان کے دعوے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ لارڈ لیک کا وہ دستاویز تھا جس کو وہ نقلی قرار دیتے تھے، لیکن حکومت کے ذمے داران کا اصرار تھا کہ یہ دستاویز اصلی ہے۔

غالب نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے ۷ جولائی ۱۸۳۰ء میں ایک مرتبہ پھر گورنر جنرل کو عرض داشت بھیج کر مقدمے پر نظر ثانی کی درخواست کی۔ غالب کی یہ درخواست قبول کر لی گئی۔ اس پورے مقدمے میں غالب کے حق میں سب سے امید افزا رپورٹ ۱۰ اگست ۱۸۳۰ء کی وہ رپورٹ ہے جو جی سوئنٹن چیف سکریٹری برائے حکومت ہند نے لکھا تھا۔ اس میں اس نے کئی سوالات قائم کیے تھے۔ مثلاً:

> ”اس (غالب) کی بار بار اور براہ راست اپیل نے مجھے تمام کاغذات دیکھنے اور گورنمنٹ کو مذکورہ بالا بیان پر غور کرنے کی زحمت دینے کی ترغیب بیانات کی بنا پر جیسا کہ میں سمجھتا ہوں اسد اللہ کی شکایات بالکل بے بنیاد نہیں ہیں۔“

(جاگیر غالب، ص: ۶۱)

> ”شمس الدین خاں کی جواب میں آئی ہوئی چٹھی جو مسٹر ہاکنس نے اپنے مراسلہ مورخہ ۵ مئی ماہ گزشتہ کے ساتھ بھیجی ہے، وہ بہت لاابالی انداز میں لکھی گئی ہے اور اسد اللہ کے

> تمام دعوؤں کو یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ وہ رومان پیدا کر کے شاعرانہ مراعات سے فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن مقدمے پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہیے۔ احمد بخش کی سند مورخہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو پرکھنا چاہیے، جو اصلی ہے اور جس کی تصدیق گورنر جنرل بہ کونسل ہو چکی ہے۔ اس کی ایک نقل اسی تاریخ کے مراسلہ سر جان مالکم کے ہمراہ ملے گی، وہ عطیہ حقیقتاً دس ہزار روپئے سالانہ نصر اللہ خاں کے خاندان کے لیے تفویض ہوا ہے، لیکن بدقسمتی سے سند مورخہ ۴ مئی ۱۸۰۱ غیر واضح انداز میں لکھی ہوئی ہے اور رقم کے تعین کا ذکر نہیں اور لگان میں ۲۵ ہزار سے ۱۵ ہزار روپئے کی تخفیف نصر اللہ خاں کے خاندان کی پرورش اور کفالف کے خاص مقصد کے لیے ہے۔ یہ مذکورہ بالا تخفیفات اور شرائط کی طرف اشارہ کرتی ہے، لیکن تخفیفات اور شرائط غیر مخصوصانہ انداز میں مذکورہ ہیں۔''

(جاگیر غالب، ص: ۶۵-۶۴)

> ''اگر دستاویز اصلی ہی ہے تو یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ احمد بخش خاں نے اس کو دھوکہ سے حاصل کر لیا ہو، بالفرض اگر لارڈ لیک نے رضامندی سے بھی وہ لکھی ہو تو کیا ان کو ایسا اختیار حاصل تھا۔ میرے خیال میں خواہ یہ دستاویز اصلی ہو یا جعلی، ظاہر یہی ہوتا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے اقربا زیادہ وظیفے کے حق دار ہیں۔''

(جاگیر غالبؔ ص: ۷۰)

خلیق انجم نے لکھا ہے اب تک کے مقدمے میں یہ پہلی ایسی رپورٹ تھی جس میں غالب کے دعوے کی حمایت کی گئی تھی اور نواب احمد بخش پر انگلی اٹھائی گئی تھی۔ لیکن اس کا فائدہ غالب کو نہیں مل پایا اس لیے کہ اس سے پہلی ہی جان میلکم نے اس دستاویز کے اصلی ہونے کی تصدیق کر دی تھی۔

۳۱ دسمبر ۱۸۳۰ء کو جارج سائمن معتمد اعلیٰ حکومت ہند نے دہلی کے ریذیڈنٹ مارٹن کوسی کے خط کی نقل بھیجتے ہوئے لکھا کہ:

> ''نورس کا خط پڑھنے سے آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ مدعی (غالب) نے لارڈ لیک صاحب بہادر کے دستخط اور مہر سے جاری ہونے والے جس پروانے یا مراسلے کو جعلی قرار دیا ہے اس کو جناب سر جان میلکم نے صحیح دستاویز تسلیم کیا ہے۔''

> ''جنرل لارڈ لیک بہادر جنگ سپہ سالار نے ان (نواب احمد بخش خاں) کی خیر

> اندیشی اور جانفشانی کے پیش نظر محالات فیروز پور جھر کہ .... مع مال اور تمام بندوبست سوائے ان باغات جاگیروں درختوں اور ذاتی چیزوں کے جو کہ قدیم سے مقرر ہیں ہمیشہ کے لیے بخش دیے ہیں بشرطیکہ وہ ان کو اچھی حالت میں رکھیں اور کسی قسم کی معاونت طلب کریں اور خواجہ حاجی وغیرہ جو کہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متوسلین ہیں کہ پرورش و پرداخت کریں اور کمپنی سرکار کی خیر اندیشی اور جانفشانی سے خدمت کریں، بوقت ضرورت اور حسب الطلب پچاس سوار سرکار میں حاضر کریں۔"

(حیات غالب کا ایک باب، ص:۱۹)

۷ جون ۱۸۰۶ء کی لارڈ لیک کی سند میں لکھا ہے کہ:

> محالات فیروز پور جھر کہ .... معمولہ صوبہ دار الخلافت شاہجہان کے مال اور مستقبل کے کار ہائے ضروری کے متصدی قانون گو، چودھری، مقدم، زمیندار اور مزارع جان لیں کہ متذکرہ محالات مع مال و تمام انتظام سوائے باغات املاک جاگیر اور معافی وغیرہ کہ قدیم سے مقرر ہیں۔ .... گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ نے اپنے دستخط اور مہر سے نواب احمد بخش خان بہادر مع فرزنداں کے لیے نسلاً بعد نسلاً انگریز بہادر کی سرکار کی دولت خواہی کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔ چنانچہ سرکار ممدوح کو محالات مرقومہ سے کوئی سروکار نہ ہوگا، کیوں کہ نواب موصوف کو ان محالات کا مستقل مالک بنا دیا گیا ہے۔ وہ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری میں حاضر رہیں اور مالیہ ادا کرتے رہیں۔"

(حیات غالب کا ایک باب، ص:۲۰)

مذکورہ بالا دونوں سندوں میں کتنی رقم پنشن میں دی جائے گی اس کا ذکر ہی نہیں ہے۔ البتہ گورنر جنرل کی سند میں خواجہ حاجی کا نام صراحتاً موجود ہے۔ اس کی بنیاد پر ملک اختر حسین کا خیال ہے کہ غالب کی نظر سے لارڈ لیک کی درخواست گزری ہی نہیں تھی۔ انہوں نے اس کے بارے میں کسی سے سن رکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب پنشن کی طویل پیروی اور بار بار افسران کی جانب سے لارڈ لیک کی سند کو اصلی قرار دینے کی وجہ سے جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ اب غالب نے نتیجے کی پرواہ کیے بغیر سرکاری افسران پر رشوت خوری اور لارڈ لیک پر سرکاری کاموں میں لاپرواہی کا الزام لگا دیا۔ غالب نے گورنر جنرل ولیم بنٹنک کے نام ایک درخواست میں لکھا کہ:

> ’’اس سند پر لگی ہوئی مہر اور دستخط سب جعلی ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ سند مرحوم نواب احمد بخش خاں نے اپنی رہائش گاہ پر تیار کی اور لکھوائی اور عملے کو رشوت دے کر اس زمانے میں جب لارڈ لیک صاحب بہادر دوسرے اہم معاملات میں بہت الجھے ہوئے تھے، اس دستاویز کو فارسی زبان کی دوسری ڈھیروں دستاویزات اور کاغذات میں رکھ کر جو روزانہ دستخط کے لیے ان کے سامنے گزاری جاتی ہیں یہ درخواست بھی پیش کروائی۔ اس پر دستخط حاصل کر لیے۔ اور یہ اپنی نوعیت کا بدترین فریب اور انتہائی گھٹیا اور خطرناک جعل سازی تھی۔‘‘

(غالب کا سفر کلکتہ، خلیق انجم، ص: ۱۱۸)

ممکن ہے کہ حقیقت میں ایسا ہوا ہو، لیکن غالب کی اس درخواست کے بعد وہ افسران بھی غالب کے مخالف ہو گئے جو ان کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایف ہاکنس قائم مقام ریزیڈنٹ دہلی جو غالب کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرتے تھے انہوں نے اپنے رپورٹ میں لکھا:

> ’’نواب صاحب (شمس الدین احمد خاں) نے مطلوبہ خط جو فارسی میں لکھا ہوا ہے اور جس پر لارڈ لیک بہادر کی مہر اور دستخط ثبت ہیں، مجھے ارسال کر دیا ہے اور اسے پیش کرتے ہوئے مجھے امید ہے کہ اس طرح یقین ہو جائے گا جس طرح مجھے گزشتہ مئی میں اُس وقت یقین ہو گیا تھا جب میں نے اسے دیکھا تھا اور میں نے اسد اللہ خاں کے دعوے میں رپورٹ دی تھی اور اس شخص کے جھوٹے دعوے کو تسلیم کرنے کی اذیت میں مبتلا نہیں ہوگی جس نے نہ صرف حکومت کو بلکہ آپ کو اور مجھے بہت پریشان کیا اور نواب (شمس الدین) کی دل شکنی کی۔ اب وہ شخص سزا سے نہیں بچ سکے گا۔‘‘

(غالب کا سفر کلکتہ، خلیق انجم، ص: ۱۱۹)

جارج سوئنٹن جنہوں نے غالبؔ کے حق میں رپورٹ دی تھی انہوں نے بھی ۳۱ دسمبر ۱۸۳۰ء کے اپنے ایک خط میں لکھا:

> ’’حضور والا گورنر جنرل نصر اللہ خاں کے متوسلین کی مالی امداد کے ضمن میں فیروز پور کے جاگیردار کے کیے ہوئے انتظام و انصرام میں مداخلت پسند نہیں فرمائیں گے۔‘‘

(غالب کا سفر کلکتہ، خلیق انجم، ص: ۱۱۹)

یکم مئی کو گورنر جنرل کے حکم پر ان کے معتمد میکنائن نے غالبؔ کو لکھا کہ گورنر جنرل صاحب فضیلت مآب نائب صدران کونسل کے خیالات سے کلی طور پر اتفاق فرماتے ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں نواب شمس الدین خاں سے موجودہ پنشن میں اضافے کا مطالبہ سراسر ناروا ہے اور جنرل لارڈ لیک صاحب کی عطا کردہ سند جس میں مختلف حصے داروں کے نام مخصوص رقم کا اندراج ہے، بالکل صحیح ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پنشن میں اضافہ کا دروازہ حکومت کی طرف سے بند کر دیا گیا، لیکن پھر بھی غالب کہاں ماننے والے تھے۔ جب نواب شمس الدین خاں کو ۱۹ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی دے دی گئی اور ان کی جائداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی، تو غالب کو یہاں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ٹی۔ ٹی مٹکاف کے سامنے نواب صاحب کے قرض خواہوں کی درخواستیں پیش کی جانے لگیں، تو غالبؔ نے بھی آگرے کے گورنر ولیم ہلنٹ کے سامنے اپنی درخواست پیش کی، جس میں انہوں نے ایک نیا مطالبہ جوڑ دیا۔ انہوں نے لکھا کہ حکومت نے غالب اور ان کے متعلقین کے لیے دس ہزار کی پنشن منظور کی تھی لیکن انہیں صرف تین ہزار سالانہ ہی ملتی رہی۔ چنانچہ ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۵ء تک ساٹھ ہزار سالانہ کے حساب سے بقایا جو دو لاکھ تین ہزار ہوتا ہے نواب شمس الدین کی جائداد سے انہیں ادا کیے جائیں۔ جب یہ درخواست مٹکاف کے سامنے آئی تو اس نے اس کو رد کر دیا۔ آخری کوشش کے طور پر غالب نے ایک درخواست ملکہ برطانیہ کو بھی بھجوائی، لیکن اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کے بعد غالبؔ کی پنشن کچھ دنوں کے لیے بند کر دی گئی، جس کے لیے غالب کو پھر سے جدوجہد کرنا پڑا۔ تین سال بعد یہ پنشن بحال ہوئی، لیکن وہی ڈیڑھ ہزار سالانہ والی پنشن بحال ہوئی جو انہیں پہلے ملتی رہی تھی۔ غالب کے پنشن کے قضیے کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ غالبؔ جب پنشن کے سلسلے میں کلکتے گئے تو انہوں نے دو سالوں تک پنشن نہیں لی۔ غالب کی بیوی نے حکومت کے پاس درخواست جمع کرائی کہ ان کے شوہر کے بقایا جات میں سے انہیں بھی رقم دلائی جائے۔ جب اس سلسلے میں غالب سے پوچھا گیا کہ وہ کتنی رقم اپنی بیوی کو دیں گے تو انہوں نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو چار سو روپئے سالانہ دینے کا ارادہ کیا ہے، لیکن پچھلے پانچ سالوں سے وہ انہیں کچھ نہیں دے پائے ہیں۔

غالبؔ کے پنشن کے پورے قضیے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے غالبؔ کے دعوے میں کچھ صداقت ہے، لیکن سرکاری دستاویز ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، اس وجہ سے بعد کے انگریز افسران جو غالب کے خیر خواہ بھی تھے ان کے حق میں کچھ نہیں کر سکے۔ اس لیے کہ ساری بحث لارڈ لیک کی سند کے اصلی یا فرضی ہونے کے گرد گھوم کر رہ جاتی تھی اور اس کی تصدیق پہلے ہی ہو چکی تھی کہ سند پر موجود دستخط لارڈ لیک ہی کے ہیں۔

20.3.6 ماحصل

عزیز طلبا! مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ غالب کے پنشن کے قضیہ کافی پیچیدہ ہے۔ غالبؔ اگر چہ پنشن کی رقم بڑھوانے میں کامیاب نہیں ہوئے، لیکن اسی بہانے انہوں نے دہلی سے باہر کا ایک طویل سفر طئے کیا۔ اپنے وقت کے ہندوستان کے سب سے ترقی یافتہ شہر کو دیکھا۔ وہاں کے لوگوں سے ملے۔ اس سے ان کی شاعری اور فکر پر بھی گہرا اثر پڑا۔ یہ ان کے سفر کلکتہ کی دین تھی کہ انہوں سرسید کی کتاب کے دیباچہ پر انہوں فرسودہ موضوعات چھوڑ کر نئے موضوعات پر کام کرنے کو کہا۔ الطاف حسین حالی نے لکھا ہے کہ انہوں نے انگریزی سرکار میں پانچ مطالبے کیے تھے۔ پہلی یہ کہ سرکار نے جو پنشن ان کے لیے مقرر کی ہے وہ ان کو مکمل ملے۔ دوسری یہ کہ اب تک جو رقم ان کو کم ملتی رہی ہے اس کے بقایا جات ریاست فیروز پور سے دلوائی جائے۔ یہ دونوں درخواستیں نامنظور ہوئیں۔ تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ کل پنشن میں سے میرا جو حصہ قرار پائے وہ سرکار سے علاحدہ کر دیا جائے۔ چوتھی یہ کہ پنشن فیروز پور سے خزانہ سرکار میں جمع ہو جائے تا کہ رئیس فیروز پور سے مانگنی نہ پڑے۔ یہ دونوں درخواستیں منظور کر لی گئیں۔ آخری درخواست خطاب اور خلعت کی ہے، جو انہیں انگریزی سرکار کی طرف سے نہیں ملی۔

20.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- غالبؔ کی پنشن کے قضیہ کی مبادیات جانا۔
- پنشن سے متعلق غالبؔ کی ابتدائی کاوشوں کو جانا۔
- فریق مخالف کی جانب سے دیے گئے جواب کی حقیقت کو جانا۔
- غالبؔ کی پنشن سے متعلق حکمران وقت کی منشا اور ان کے احکام کو جانا۔
- مقدمے کی پیروی میں غالبؔ نے جن اقدام اور اسفار کے مراحل طئے کیے، اسے جانا۔

20.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ غالبؔ کو پنشن ملنے کے اسباب کیا تھے؟ وضاحت کیجیے۔

۲۔ پنشن سے متعلق غالب کی کیا شکایتیں تھیں؟ مختصراً تحریر کیجیے۔

۳۔ غالبؔ کے سفر کلکتہ کے متعلق اپنی معلومات کو مختصراً بیان کیجیے۔

۴۔ غالبؔ نے کلکتہ پہنچ کر ۲۸ مئی ۱۸۲۸ء کو سرکار کے پاس دی گئی درخواست میں کیا بیان کیا؟ واضح کیجیے۔

۵۔ دل برداشتہ ہو کر غالبؔ نے درخواست میں کیا تحریر کیا؟ بیان کیجیے۔

20.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ چچا نصر اللہ بیگ آگرہ قلعہ کے قلعہ دار تھے۔ جب انگریزوں نے لارڈ لیک کی سربراہی میں آگرہ کی طرف پیش قدمی کی تو نصر اللہ بیگ نے قلعہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اس سے خوش ہو کر انگریزوں نے ان کو عہدے پر برقرار رکھا۔ بعد میں اس کی پاداش میں ’’سونک‘‘ اور ’’سونسا‘‘ نام کے دو پرگنے انہیں دیے گئے۔ نصر اللہ بیگ کی بیوی اور بچے کا انتقال ان کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، اس لیے نصر اللہ بیگ کے انتقال کے بعد انگریزی سرکار نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ان کے ورثا کے لیے پنشن مقرر کر دی۔ غالب چوں کہ نصر اللہ بیگ کے بھتیجے تھے، اس وجہ سے انہیں بھی ڈیڑھ ہزار سالانہ پنشن ملتی تھی۔

۲۔ پنشن سے متعلق بنیادی طور پر غالبؔ کی دو شکایتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ ان کے مطابق سرکار نے نصر اللہ بیگ کے ورثا کے لیے دس ہزار سالانہ پنشن کی رقم مقرر کی گئی تھی۔ لیکن جائداد کے منتظم نواب احمد بخش انہیں صرف پانچ ہزار کی رقم ہی دے رہے تھے، جو غالب کے مطابق غلط تھی۔ دوسری یہ کہ نواب احمد بخش نے نصر اللہ بیگ کے ایک ملازم خواجہ حاجی کو بھی ان کے ورثا میں شامل کر کے ان کا بھی وظیفہ مقرر کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے غالب شاکی تھے کہ پنشن میں خواجہ حاجی کی شمولیت کے باعث نصر اللہ بیگ کے حقیقی ورثا کا حق مارا جا رہا ہے۔

۳۔ پنشن کے حوالے سے غالبؔ جب نواب احمد بخش سے ناامید ہو گئے تو انھوں نے انگریز سرکار کے سامنے اپنا معاملہ خود رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کو معلوم ہوا کہ گورنر جنرل صاحب کانپور کے راستے دہلی آ رہے ہیں اور ان کے استقبال کے لیے دہلی کے ریزیڈنٹ مٹکاف کانپور جانے والے ہیں۔ تو انھوں نے اس امید پر کانپور کا سفر کیا کہ مٹکاف سے وہاں پر یا دہلی واپسی کے وقت راستے میں ملاقات کا موقع مل جائے گا۔ غالبؔ کانپور پہنچ کر بیمار ہو گئے اس وجہ سے ان کی ملاقات مٹکاف سے نہ ہو سکی۔ علاج کی غرض سے وہ لکھنؤ گئے جہاں وہ تقریباً پانچ مہینے رہے۔ اس کے بعد باندہ میں گئے، کیوں کہ وہاں کے نواب صاحب سے ان کے پرانے تعلقات تھے۔ نواب کی تیمارداری اور علاج سے وہ مکمل صحت یاب ہو گئے تو انھوں نے دہلی واپس جا کر قرض خواہوں کا سامنا کرنے کے بجائے کلکتہ جا کر سرکار عالیہ میں درخواست دینا مناسب سمجھا۔ اس غرض کے لیے نواب باندہ سے غالب نے پیسوں کی درخواست کی، تو انھوں نے دو ہزار روپئے کا انتظام کرا دیا۔ غالبؔ الہ آباد، بنارس، مرشدآباد ہوتے ہوئے خشکی کے راستے سے ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ یہ سفر انھوں نے گھوڑے سے طے کیا۔ راستے میں ان کے ساتھ تین ملازم بھی تھے۔ غالب کلکتہ میں ڈیڑھ سال تک مقیم رہے۔ جب غالب کو معلوم ہوا کہ گورنر جنرل دہلی جا رہے ہیں، تو وہ ۱۴ اگست ۱۸۲۹ء کو کشتی کے راستے سے دہلی واپس چلے آئے۔

۴۔ ۲۸ مئی ۱۸۲۸ء کو دی گئی درخواست میں انھوں نے اول اپنی پنشن کے لیے نواب احمد بخش سے جو درخواستیں کی تھیں اس کی روداد بیان کی۔ اس کے بعد وہ اپنے مطالبات کا بیان کرتے ہوئے لکھا کہ خواجہ حاجی کا تعلق نصر اللہ بیگ کے خاندان سے نہیں ہے۔ وہ نصر اللہ بیگ خان کے گھرانے کا ایک ملازم تھا۔ اس نے نصر اللہ بیگ کے سارے مال و اسباب پر قبضہ کرلیا اور ستاسی سواروں، ایک ہاتھی اور اسباب حرب کے ساتھ نصر اللہ بیگ کے سسر نواب احمد بخش خاں سے جا ملا۔ مزید یہ بھی لکھا کہ سوائے اس کہ خواجہ حاجی کی والدہ نصر اللہ بیگ خاں کی ماں کی بہن یعنی خالہ کی بیٹی تھیں، ان میں اور نصر اللہ بیگ میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کو دیا جانے والا وظیفہ نصر اللہ بیگ کے حقیقی وارثین کے ساتھ ناانصافی ہے۔

5۔ دل برداشتہ ہوکر غالب نے لکھا کہ ''میرا ارادہ ہے کہ اگر حکومت نے میرے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی تلافی کردی اور میرے دعوؤں کی شنوائی کی تو بامراد و مطمئن اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ اور آرام سے زندگی بسر کروں گا اور اپنے غریب بھائی کے معالجے کی کوشش کروں گا اور اگر ارباب حکومت میرے مقدمہ میں تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کریں گے، تو میں یہاں سے جدھر منہ اٹھے گا چلا جاؤں گا۔ اپنے لباس کو تار تار کردوں گا اور خاک چھانتا عرب اور دوسرے ممالک کے اجنبی شہروں میں ساری زندگی بھیک مانگ کر گزار دوں گا، کیوں کہ اس اعزاز کے ساتھ کہ حکومت سے میرے مراسم بڑے اچھے ہیں۔ میں ہندوستان میں کسی کے در پر بھیک مانگنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

20.7 فرہنگ

(الفاظ)	(معنی)
پس ماندگان	ورثا، آل اولاد، لواحقین
پنشن	وظیفہ
جاگیر	گاؤں یا علاقہ جو سرکار خدمت کے عوض کسی کو دے
حف	دعائیہ کلمہ، چشم بد دور
متصدی	ذمے دار، حساب کتاب دیکھنے والا
متوسلین	متعلقین میں شامل افراد، منحصر اشخاص
محالات	جاگیریں
مطرا	تازہ، شاداب

دستاویز	:	وہ کاغذ جو دو یا دو سے زیادہ شخصوں کے مابین کسی معاملہ میں بطور سند لکھا جائے
دل برداشتہ	:	بے زار، اکتایا ہوا، جس کا دل کسی کام سے اچاٹ ہو
تعلقات	:	جاگیر، مالیت
خلعت	:	عطیہ، انعام
برآوری	:	امید پوری ہونا
معتمد	:	سیکرٹری، قابل اعتبار
مختار نامہ	:	وہ تحریر یا دستاویز جس کے ذریعے سے کسی شخص کو مختار بنایا گیا ہو
تشخیص	:	پہچان، پرکھ، تصفیہ
عرض داشت	:	عرضی، درخواست، گزارش
حسب الطلب	:	چاہنے کے مطابق، خواہش کے مطابق
مالیہ	:	محاصل، لگان

20.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ یادگار غالب : الطاف حسین حالی
۲۔ حیات غالب کا ایک باب (تحقیق کی روشنی میں) : ملک حسن اختر
۳۔ غالب احوال و آثار : حنیف نقوی
۴۔ جاگیر غالب : پرتھوی چندر
۵۔ غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتہ کا ادبی معرکہ : خلیق انجم

اکائی 21 غالبؔ کے ادبی معرکے

ساخت

21.1 اغراض ومقاصد
21.2 تمہید
21.3 غالبؔ کے ادبی معرکے
  21.3.1 ادبی معرکے کا مفہوم اور اقسام
  21.3.2 ادبی معرکوں کے اسباب وعلل
  21.3.3 غالبؔ کے ادبی معرکے
  21.3.4 ماحصل
21.4 آپ نے کیا سیکھا؟
21.5 اپنا امتحان خود لیجیے
21.6 سوالوں کے جوابات
21.7 فرہنگ
21.8 کتب برائے مطالعہ

21.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- ادبی مقابلے، ادبی مباحثے اور ادبی معرکے کے مابین افتراقی پہلوؤں سے واقف ہوں گے۔
- ادبی معرکوں کے مفہوم اقسام اور ان کے اسباب وعوامل سے متعارف ہوں گے۔
- غالبؔ کے ادبی معرکوں کے بنیادی محرکات سے روشناس ہوں گے۔
- کلکتہ اور قاطع برہان جیسے اہم ادبی معرکوں سے متعارف ہوں گے۔
- غالب کے ادبی معرکوں کی اہمیت وافادیت اور معنویت سے واقف ہوں گے۔

21.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ نے غالب کی پنشن کے قضیہ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ جس میں آپ نے

جانا کہ غالب کو اپنی پنشن کے متعلق حکومت سے کیا شکایات اور مطالبات تھے۔ پنشن کی بحالی اور اضافے کے لیے انھوں نے کس قدر پیروی میں مشقتیں اٹھائیں اور کن مراحل سے انہیں گزرنا پڑا، لیکن اس کے باوجود بھی انہیں کامیابی نہیں ملی۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں غالب کے ادبی معرکوں کا مطالعہ کریں گے۔ عزیز طلبا! ادبی معرکہ آرائی کو شمالی ہند کے تناظر میں دیکھا جائے تو فارسی شعر و ادب کے تعلق سے شیخ علی حزیں اور خان آرزو کے درمیان معرکے اردو کے ابتدائی معرکوں سے پیوستہ ہیں۔ ان میں نہ کوئی زمانی بعد ہے اور نہ ہی کوئی انقطاع۔ ایرانی فارسی گویوں اور شعرائے سبک ہندی کے معرکوں نے اس تعلق سے ان کی رہنمائی کی۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ادبی معرکے شاعروں اور ادیبوں کے محض نجی جھگڑے نہیں ہیں۔ اگر چہ ادبی معرکے اکثر نجی حملوں اور ذاتیات پر رکیک فقروں میں تبدیل ہوجاتے تھے لیکن ان میں موجود ادبی و لسانی مباحث شاعر و ادیب کی ذات پر حملوں سے زیادہ لائق توجہ اور قیمتی ہیں۔ غالب کے ادبی معرکے بھی پر متعدد جہتوں سے قابل قدر ہیں، جس کا اندازہ آپ کو بہ خوبی دوران مطالعہ ہوگا۔

21.3 غالبؔ کے ادبی معرکے

21.3.1 ادبی معرکے کا مفہوم اور اقسام

آپ نے عرب کے دو بازاروں ’’عکاظ‘‘ اور ’’ذوالمجاز‘‘ کا نام ضرور سنا ہوگا۔ ان بازاروں کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں گرد و نواح کے کاریگروں، ماہرین اور تاجر پیشہ افراد کے ساتھ ساتھ مشہور شعرا بھی شریک ہوتے تھے اور فی البدیہہ اشعار سناتے تھے۔ یہ اشعار دیگر موضوعات کے علاوہ کسی قبیلے کے سردار یا بڑے آدمی کی مدح میں بھی ہوتے تھے۔ اپنے مدحیہ اشعار کی بدولت یہ شعرا خاصا انعام و اکرام حاصل کر لیتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعرا کا مقصد محض مالی منفعت ہوتا تھا بلکہ اپنی استادی اور زور بیان کا سکہ بٹھانا بھی ان کے پیش نظر ہوا کرتا تھا۔ استادی کی دھاک جمانا دراصل دوسرے، ہم عصر شعرا پر فوقیت حاصل کرنے کا جذبہ ہے۔ ان بازاروں میں مختلف شعرا ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے اور حکم ان کی تخلیقات پر فیصلہ سناتے تھے۔ جس شاعر کے حق میں حکم نے فیصلہ کر دیا وہ عرب کا بڑا شاعر تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ عربی ادب کی تاریخ میں ایسے کئی فیصلے رقم ہیں۔ ان مقابلوں کو ادبی مقابلہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ دھیان رہے کہ بسا اوقات ایسے مقابلے ادبی معرکوں کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتے ہیں۔

ادبی معرکے کے تعلق سے ایک اور صورت حال کا ذکر ضروری ہے۔ آپ نے متعدد سیمینار، سمپوزیم اور بحث و مباحثہ کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ ان میں فریقین ایک متعینہ موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں اور موضوع تمام ابعاد اور مختلف پہلوؤں پر بحث و مباحثے کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی فریقین ایک دوسرے سے متفق ہوجاتے ہیں اور کبھی ان کے درمیان اختلاف بہ دستور قائم رہتا ہے۔ یہ صورت حال ’’ادبی مباحثہ‘

کہلاتی ہے۔ لیکن اختلاف بدستور قائم رہنے کی صورت میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ فریقین کے درمیان اختلاف رائے کا اظہار اور جوابی تحریریں رسائل و اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بسا اوقات ادبی مباحثے بھی ادبی معرکوں کا سبب ہوتے ہیں۔ اخبارات و رسائل سے ادبی معرکوں کی شروعات براہِ راست بھی ہوتی ہے۔

ادبی مقابلے اور ادبی مباحثے کے نتیجے میں مخصوص ادبی موضوعات و مسائل کے مختلف ابعاد سامنے آتے ہیں اور امکان کی نئی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ یہی فوائد ادبی معرکوں سے بھی حاصل ہوتے ہیں لیکن ادبی معرکے اختلاف رائے میں شدت، مسابقت، مخاصمت، عیب جوئی اور طعنہ زنی کو بھی راہ ملتی ہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ جذبۂ مسابقت اور رقابت و مخاصمت نے ٹکراؤ کی ایسی صورت پیدا کر دی کہ معرکے جنگ و جدل کا نمونہ نظر آنے لگے۔ تاریخ میں موجود متشدد رویوں کو ظاہر کرنے والی روایتوں میں کچھ دخل بیان کے چٹخارے اور رنگینیِ عبارت کا بھی ہے۔ لیکن ایسی صورت حال کے اثبات سے مفر نہیں۔ کیوں کہ بعض شعرا نے شدید اختلاف سے پیدا شدہ معرکوں پر شعرا کے رویوں کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ مثال کے طور پر مرزا محمد رفیع سودا کہتے ہیں:

یک دگر ہوتا ہی ہے سقم سخن پر اعتراض
اس پہ کیا لازم جو کیجے ہو گریباں گیر جنگ

ایک ان میں سے لگا سوداؔ کے آگے پڑھنے شعر
واسطے اتنے کہ تا کیجے بہ ایں تزویر جنگ

سن کے یہ بولا خدا کے واسطے رکھیے معاف
میں تو ہوں شاعر غریب اور آپ ہیں شمشیر جنگ

اپنی نوعیت کے اعتبار سے ادبی معرکے چار طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلی نوعیت تو یہ ہے کہ دونوں فریق سرگرم عمل رہتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے کلام کی تنقیص و تعریض کرنے کے ساتھ ساتھ معترضین کے اعتراضات کا جواب بھی دیتے ہیں۔ دوسری نوعیت میں ایک فریق دوسرے فریق پر اعتراضات و ایرادات کرتا ہے اور دوسرا فریق ان پر خاموش نظر آتا ہے۔ اس صورت میں بھی دو امکان ہیں۔ ایک امکان تو یہ ہے کہ دوسرا فریق پہلے فریق کے اعتراضات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا اور خاموش رہتا ہے یا پھر وہ پہلے فریق کے ایرادات اور اعتراضات کی تاب نہ لا کر سکوت اختیار کرتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دوسرے فریق نے بھی اپنی مدافعت میں جوابی کاروائی کی لیکن وہ دست برد زمانہ ہو گئی اور اس سبب سے ہم دوسرے فریق کے جوابی حملے سے ناواقف ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی شاعر نے معاصرین میں خود کو ممتاز اور قادر الکلام ثابت کرنے کے لیے اپنے سے پہلے کے کسی مشہور اور استاد زمانہ شاعر کے کلام پر اعتراضات وارد کیے۔ اس کے اعتراضات کا جواب

دینے کے لیے وہ استاد شاعر اب اس دنیا میں موجود نہیں، لیکن اس کے شاگردوں اور حامیوں نے ان اعتراضات کا مقابلہ کیا اور معاصر معترض شاعر پر جوابی حملے کیے۔ یہ ادبی معرکے کی تیسری صورت ہے۔ کلاسیکی دور میں طرحی مشاعروں کا خاصا چلن تھا۔ ان طرحی مشاعروں میں جہاں بہت سے شعرا اپنا کلام مصرع طرح پر وضع کر کے مشاعرے میں سناتے تھے وہیں اپنے دور کے ایسے مسلم الثبوت استاد شعرا بھی اپنا کلام لے کر جاتے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر کمال فن کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کوشش میں اساتذہ کے درمیان ایک قسم کی خاموش جنگ جاری رہتی تھی۔ اس صورت کو ادبی معرکے کی چوتھی نوعیت کہا جاتا ہے۔ فنی اور لسانی نقطۂ نظر سے پہلی اور تیسری نوعیت کے ادبی معرکوں کو مکمل ادبی معرکہ کہہ سکتے ہیں کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں زبان، بیان، شعریات اور مخصوص ادبی صنف سے تعلق رکھنے والی رسومیات و تہذیبی تصورات پر ایسی ایسی باریکیاں اور دقیق نکتوں کی وضاحت و صراحت ہوتی ہے کہ بدمزگی کے باوجود معرکوں کی افادیت غالب ہوتی ہے۔ اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعرا کے درمیان خود برتر، دوسروں سے ممتاز اور قادرالکلام ثابت کرنے کے لیے معرکے وجود میں آتے تھے جو کبھی کبھار شدت اختیار لیتے اور ذاتی حملوں اور بغض وعناد نیز مخاصمت میں متشکل ہوتے تھے۔

21.3.2 ادبی معرکوں کے اسباب وعلل

ذیل میں ادبی معرکوں کے اسباب وعوامل کے اہم نکات کی نشاندہی اختصار کے ساتھ کی جاتی ہے:

۱۔ درباری سرپرستی

۲۔ استادی اور شاگردی کا ادارہ

۳۔ علاقائی تعصب: ایرانی اور ہندوستانی شعرائے فارسی، دہلی اور لکھنؤ کی مسابقت

۴۔ تذکرہ نگاری: گروہ بندی، علاقائی تعصب، معاصرانہ چشمک، استاد اور اس کے احباب نیز اپنے استاد بھائیوں کی بے جا ستائش۔

۵۔ شاعر کا اپنا مزاج: بدمزاجی اور رعونت

۶۔ تعلّی کے ذریعے معاصرین پر برتری کا اظہار (مثال کے طور پر میر کی مثنوی ’’اژدرنامہ‘‘)

۷۔ حسب ونسب پر بے جا تفاخر

۸۔ حد درجہ بذلہ سنجی اور ہنسی ٹھٹھول

۹۔ توارد کو سرقہ گمان کر کے معترض ہونا

۱۰۔ مقابلہ آرائی کی غرض سے کسی دوسرے شاعر کے رنگ میں جوابی غزل کہنا

اوپر درج تمام محرکات پر شرح وبسط کے ساتھ گفتگو ضروری تھی تاکہ ادبی معرکے کے مفہوم اور اسباب و محرکات سے آپ باخبر ہو جائیں اور ''غالب کے ادبی معرکوں'' کے مطالعے کے دوران آپ اس سے ہونے والے ادبی اور لسانی فوائد کو اخذ کر سکیں۔ ساتھ ہی یہ اندازہ بھی لگا سکیں کہ غالب کے مختلف معرکوں کے پیچھے کون سے محرکات کارفرما تھے۔

21.3.3 غالبؔ کے ادبی معرکے

بقول مالک رام مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی پوری زندگی معرکوں کی ایک مسلسل داستان ہے۔ انھوں نے مرزا غالب کے معرکوں کی درجہ بندی بھی کی ہے۔ غالب کے معرکوں میں خاندانی معرکے، مالی معرکے، جذباتی معرکے اور ادبی معرکے شامل ہیں۔ غالب کے ادبی معرکے ان کی پوری زندگی کو محیط ہیں۔ اس اکائی میں غالب کے ادبی معرکوں سے واقفیت مقصود ہے لہٰذا یہاں ہم ان کے ادبی معرکوں کا قدرے تفصیل سے ذکر کریں گے۔

مولوی محمد معظم:

غالبؔ کی زندگی کا پہلا ادبی معرکہ مولوی محمد معظم سے ان کی چپقلش ہے۔ مولوی محمد معظم، غالب کے مکتب کے استاد تھے۔ مولانا حالی ''یادگار غالب'' میں بیان کرتے ہیں کہ غالب نے گیارہ برس کی عمر سے ہی شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا اور اسی زمانے میں فارسی میں بھی فکر سخن کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ اسی ابتدائی زمانے میں غالب نے فارسی میں کچھ اشعار موزوں کیے جس کی ردیف ''کہ چہ'' تھی۔ غالب نے ''کہ چہ'' یعنی ''چہ'' کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ انھوں نے اشعار موزوں کر کے اپنے استاد مولوی محمد معظم کی خدمت میں پیش کیا۔ استاد نے غالب کی ردیف ''کہ چہ'' کو مہمل اور اشعار کو بے معنی قرار دیا۔ ایک روز غالب کو ''کہ چہ'' کی سند ملا ظہوری کے کلام سے مل گئی اور ظہوری کا شعر استاد کو دکھایا۔ شیخ معظم سند دیکھ کر حیران ہو گئے اور مرزا غالب کی یہ کہہ کر پذیرائی کی کہ ''تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے''۔ اوئل عمری کے اس واقعے کو غالب کی استاد کے ساتھ چپقلش یا معرکہ آرائی کا نام دینا مناسب نہیں۔ شاگرد کی ذہانت اور تلاش و جستجو کو دیکھتے ہوئے استاد کا کلمۂ تحسین ادا کرنا چپقلش یا معرکہ نہیں۔ البتہ اس واقعے سے جہاں غالب کی ذہانت اندازہ ہوتا ہے وہیں معرکہ آرائی سے ان کی فطری مناسبت کا بھی احساس ہوتا ہے۔

شعرائے دہلی:

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ غالب کا خاص اسلوب مشکل پسندی اور پیچیدہ گوئی ہے۔ غالب بنیادی طور پر ایک خیال بند شاعر تھے اور ماضی قریب کے سبک ہندی کے شعرا سے خاصے متاثر تھے۔ اس تعلق سے مرزا

عبدالقادر بیدل ان کے پسندیدہ شاعر تھے اور بیدل کی طرز خاصی پیچیدہ تھی۔ گویا مرزا غالب فارسی اور اردو شاعری میں سبک ہندی کے استاد شعرا کا تتبع کرتے تھے۔ غالب نے اوائل عمری ہی سے فارسی ادبیات کا وسیع مطالعہ کیا تھا، لہٰذا فارسی اسالیب کی طرف ان کا میلان بالکل فطری تھا۔ ظاہر ہے مضمون آفرینی کوئی آسان طرز نہیں اور عجب نہیں کہ ابتدا ہی سے اس کی طرف میلان اور پیروی نے نوآموزی کے زمانے میں ناکامی ہاتھ آئی ہو۔ اس صورت میں غالب پر مہمل گوئی کا الزام لگنا بعید نہیں۔ دہلی میں غالب کی مشکلات اور مخالفت کے تعلق سے حالی نے ''یادگار غالب'' میں تین روایتیں نقل کی ہیں۔ پہلی روایت ذیل میں درج کی گئی ہے:

> ''خود مرزا کی زبانی سنا کیا ہے کہ میر تقی میر نے، جو مرزا کے ہم وطن تھے، ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ ''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔''

مندرجہ بالا اقتباس میں دو باتیں قابل غور ہیں لیکن اس سے پہلے چند امور پر توجہ دینی ضروری ہے۔ شعرائے دہلی سے غالب کی چھیڑ چھاڑ کے تعلق سے حالی کی مذکورہ روایت کو اولین واقعے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ میر کا انتقال ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ غالب ۱۸۱۳-۱۸۱۲ میں مستقل طور پر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اس وقت ان کی عمر پندرہ یا سولہ برس کی تھی۔ اس سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں کہ میر کو غالب کا جو بھی کلام دکھایا گیا وہ آگرے میں کہا گیا اور اس وقت غالب کم عمر ہی تھے۔ اس واقعے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ میر تقی میر کلام غالب کی فہم سے قاصر تھے یا انھوں نے غالب کی ناقدری کی، مضحک بات ہے۔ اوپر درج اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر نے غالب کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور ان میں ایک اچھے شاعر کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میر جیسے استاد شاعری چھوڑ کر کوئی اور پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتے۔ لہٰذا اس واقعے کو ایک استاد شاعر کی طرف سے نوآموز کے لیے نیک خواہشات ہی سمجھنا چاہیے۔

دوسرا واقعہ حکیم آغا جان عیش کا ہے۔ دہلی کے ایک مشاعرے میں حکیم آغا جان عیش نے اپنی ایک غزل پڑھی جس میں قطعہ بند اشعار بھی شامل تھے۔ ان قطعہ بند اشعار کے نشانے پر غالب کی زبان اور ان کا اسلوب بیان تھا۔ قطعہ ملاحظہ کیجیے:

زبان میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر اون کی زبان وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے تم کہو اور دوسرا سمجھے

مولانا الطاف حسین حالی نے تیسرا واقعہ مولوی عبدالقادر رامپوری کا بیان کیا ہے۔ مولوی عبدالقادر رامپوری ظریف الطبع آدمی تھے۔ قلعۂ معلیٰ سے بھی ان کا تعلق رہا۔ ایک دن انھوں نے غالب سے کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آیا اور دو مصرعے فی البدیہہ موزوں کر کے مرزا غالب کو سنایا:

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب نے احتجاج کیا کہ یہ شعر میرا نہیں ہے، لیکن عبدالقادر رامپوری نے اصرار کیا کہ یہ شعر میں نے آپ کی غزل میں دیکھا ہے۔ غالب سمجھ گئے کہ عبدالقادر رامپوری انھیں مہمل گو کہہ رہے ہیں۔ ان تین واقعات سے کسی قسم کی معرکہ آرائی کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ابتداً دہلی میں غالب کے اشعار کا نہ صرف مذاق اڑایا گیا بلکہ غالب کو شعرائے دہلی کی مخالفت بھی درپیش تھی، لیکن یہ مخالفت بہت شدید نہیں تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی ''یادگار غالب'' میں لکھتے ہیں:

> ''سنا گیا ہے کہ اہل دہلی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے، جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پرشوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں۔ مگر معنی ندارد، گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔''

درج بالا تینوں واقعات کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ہم اسے ادبی معرکے کی دوسری قسم کہہ سکتے ہیں جس میں دوسرا فریق پہلے فریق کے ایرادات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا اور خاموش رہتا ہے۔ دہلی میں غالب کو خفیف یا شدید کسی بھی قسم کی مخالفت کا سامنا کیوں کرنا پڑا، اس تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کو اپنی فارسی دانی اور حسب نسب پر حد درجہ ناز تھا۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ کسی شاعر کا حد سے زیادہ تفاخر بھی بسا اوقات مخالفت اور معرکے کا سبب ہوتا ہے۔

کلکتے کا ادبی معرکہ:

غالب کا قیام کلکتہ اور یہاں وقوع پذیر ادبی معرکہ کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اس کی پہلی اہمیت تو یہی ہے کہ لسانی مباحث کے اعتبار سے یہ صحیح معنوں میں غالب کے اولین ادبی معرکے کی حیثیت رکھتا۔ اس معرکے میں پہلی دفعہ ہندوستانی فارسی گویوں، فرہنگ نویسوں اور مرزا قتیل کے بارے میں غالب کے خیالات صریح اور واضح طور

پر سامنے آئے۔ اس معرکے میں مرزا غالب کی قتیل دشمنی کا اظہار ہوا جس کے سبب ایک اور معرکہ ''قاطع برہان'' کی شکل میں سامنے آیا۔

کلکتے کا ادبی معرکہ فارسی دانی میں غالب کی تعلّی کے سبب وجود میں آیا۔ قبل اس کے اس معرکے کی تفصیل پیش کی جائے غالب کے مزاج اور ذہن کو سمجھنا ضروری ہے۔ غالب کو اپنی فارسی دانی پر اس قدر ناز تھا کہ وہ ہندوستانی فارسی گویوں میں امیر خسرو اور اپنے علاوہ کسی کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اس تعلق سے وہ حد درجہ خودستائی کا شکار تھے۔ فارسی کے مشہور زمانہ شاعر صائب اصفہانی کو مرزا غالب مسلم الثبوت شاعر مانتے تھے، لیکن اس کی سند محض اس لیے قبول نہیں کرتے کہ وہ وارد شاہجہاں آباد تھا۔ فیضی کی بھی ان کے نزدیک ٹھیک نکل جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے ایسا زعم اور ایسی خودستائی اہل علم کے نزدیک مستحسن نہیں ہو سکتی تھی۔ جب غالب فارسی کے شاعر صائب اصفہانی کو محض اس وجہ سے سند نہیں مانتے کہ وہ شاہجہاں آباد وارد ہوا تھا تو وہ خود کو کیسے مستند کہہ سکتے تھے جس کی پیدائش ہی ہندوستان میں ہوئی۔ ان کی یہی خودستائی کلکتہ میں ان پر اعتراضات و ایرادات کی بوچھاڑ کا سبب بنی۔

غالب ۱۸۲۵ء کے اواخر میں عازم کلکتہ ہوئے اور فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتے پہنچے۔ اس سفر کا مقصد ان کی خاندانی پنشن کا قضیہ تھا۔ غالب چاہتے تھے کہ کلکتے میں گورنر جنرل کی کونسل کے سامنے اپنے حالات رکھیں اور دادخواہی کریں۔ اس زمانے میں کلکتے کا مدرسۂ عالیہ علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ یہاں ہر مہینے کے پہلے اتوار کو بزم سخن آراستہ ہوتی تھی۔ اسی کے ایک مشاعرے میں غالب نے اپنی ایک غزل پیش کی جس کا ایک شعر حسب ذیل ہے:

جزوے عالم از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں بر خیزد

درج بالا شعر پر یہ اعتراض وارد ہوا کہ مصرع اولیٰ میں 'ہمہ عالم' کی ترکیب غلط ہے۔ ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ ''بیشم'' کی جگہ ''بیشترم'' کہنا چاہیے تھا۔ تیسرا اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ ''موئے زمیاں'' کی ترکیب بھی غلط ہے۔ اب یہ صورت پیدا ہوئی کہ غالب کا پورا مصرع ہی غلط ٹھہرا۔ اس میں پہلا اعتراض اس بنا پر کیا گیا کہ 'ہمہ' جمع اور 'عالم' واحد ہے۔ جمع اور واحد کا یہ اجتماع قتیل کے اجتہاد کی رو سے غلط ہے جائز نہیں۔ قتیل کی سند پر غالب نے اعتراض کرنے والوں کو ڈانٹ کر کہا کہ ''کون قتیل! وہ فرید آباد کا کھتری بچہ! اساتذۂ ایران کے مقابلے میں اس کی حیثیت ہی کیا ہے کہ میں اس فرومایہ کی سند قبول کرلوں!'' اس زمانے میں قتیل کے تلامذہ، معتقدین اور مداحین کی خاصی تعداد موجود تھی۔ قتیل کے لیے غالب کے نازیبا اور تحقیر آمیز کلمات ان لوگوں کو سخت ناگوار گزرے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ حالاں کہ اس بات کی بھی سند نہیں ملتی کہ قتیل کا یہ اجتہاد کس کتاب میں درج

ہے۔ غالب کے دوستوں نے غالب کی طرف سے اعتراضات کے جواب اساتذۂ فن کے کلام سے بھی دیے، لیکن ہنگامہ کسی طرح فرو نہ ہوا اور مشاعرہ گاہ سے نکل کر کلکتے کے کوچہ و بازار تک پہنچ گیا۔ یہ بھی قیاس لگایا جاتا ہے کہ غالب کے مخالفین نے ان کے کلام پر اعتراضات لکھ کر شائع بھی کرا دیا تھا۔ جب مخالفت کا بازار گرم ہو گیا تو غالب نے اپنے دوستوں نواب اکبر علی خان طباطبائی اور مولوی محمد محسن کے مشورے پر ''آشتی نامہ'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں کلکتہ کے علما و فضلا کی تعریف بیان کرتے ہوئے اپنی بیکسی کا ذکر کیا، لیکن قتیل کی سند کے حوالے سے اپنے موقف پر بھی ڈٹے رہے۔ یہ مثنوی غالب کی ''کلیات نظم فارسی'' میں ''باد مخالف'' کے نام سے شامل ہے۔ اسی مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی ایک دوسری فارسی غزل کے اور ایک شعر پر اعتراض کیا گیا کہ اس میں ''ردیف زدۂ بہمزہ کا استعمال غلط ہے''۔ پہلے غالب کا شعر ملاحظہ کیجیے اس کے بعد اعتراض پر غالب کا جواب سنیے:

شور اشکے بفشار بُن مژگاں دارم
طعنہ بر بے سرو سامانی طوفاں زدۂ

مندرجہ بالا شعر کے اعتراض پر غالب نے ''آشتی نامہ'' میں حسب ذیل جواب دیا ہے:

باوجودے کہ شعر من صافست
زدہ را می زند چہ انصافست

اعتراض آتشم بجاں زدہ است
شعلہ در مغز استخواں زدہ است

زدہ را کسرہ از ظرافت نیست
یای وحدت بود اضافت نیست

اس آشتی نامے کے بعد مخالفین غالب کی شدت میں کمی آ گئی۔

اس معرکے کی نوعیت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ ادبی معرکے کی پہلی صورت سے تعلق رکھتا ہے، لیکن جب اعتراض بہ سند قتیل وارد ہوا اور مرزا غالب نے قتیل کے لیے نازیبا الفاظ اور لہجۂ تحقیر اپنایا تو معرکے کی نوعیت تیسری قسم کی بھی ہو گئی، جس کے تحت اعتراض کسی فوت شدہ شاعر پر ہو اور اس مرحوم کے حامی اور تلامذہ مقابلے پر آ جائیں۔ اس معرکے کی علت فارسی زبان دانی پر غالب کے بے جا تفاخر ہے۔ غالب کے سپاس نامے کے سبب کلکتے کا یہ معرکہ تو فرو ہو گیا، لیکن انھوں نے قتیل کا پیچھا تا عمر نہیں چھوڑا اور اپنے خطوط میں بیسیوں جگہ

دوسرے ہندوستانی فارسی گویوں بالخصوص قتیل کی تنقیص کرتے رہے۔

قاطع برہان کا قضیہ:

غالب کی کتاب ’’قاطع برہان‘‘ ۱۸۶۲ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس میں کل ۹۷ صفحات ہیں اور صفحہ ۹۸ پر غلط نامہ ہے۔ یہ کتاب دراصل فارسی لغت کی مشہور کتاب ’’برہان قاطع‘‘ از محمد حسین تبریزی میں در آئی اغلاط کی نشاندہی کرتی ہے۔ ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی پر دیسی سپاہیوں کا قبضہ ہوگیا۔ دیسی سپاہیوں کی انتقامی کاروائی کی زد پر نہ صرف انگریز بلکہ حامیان انگریز بھی تھے۔ اسی وجہ سے غالب نے گھر سے نکلنا کم کردیا اور فرصت کے وقت میں ’’برہان قاطع‘‘ کا مطالعہ شروع کردیا۔ مطالعے کے دوران کتاب میں جابجا اغلاط نظر آئیں۔ غالب نے اغلاط کے تعلق سے کتاب کے حاشیے میں اشارات لکھ لیے اور جب امن قائم ہوا تو دوستوں کے مشورے پر فارسی زبان کے طلبہ کی افادیت کے پیش نظر ان حواشی کو ’’قاطع برہان‘‘ کے نام سے فارسی زبان میں شائع کروادیا۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی مولف ’’برہان قاطع‘‘ محمد حسین تبریزی کے معتقدین نے سخت مخالفت کی۔ مولانا حالی اس مخالفت کی وجہ لوگوں کے تقلیدی رویے کو قرار دیتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ’’مرزا کے اعتراضات برہان قاطع پر کیسے ہی صحیح اور واجب ہوتے ممکن نہ تھا کہ ان کی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کی جاتی۔‘‘ واقعہ یہ ہے کہ غالب جب ’’برہان قاطع‘‘ پر حاشیہ لکھ رہے تھے اس وقت انھوں نے کہیں سنجیدگی کے ساتھ معنی کی تصحیح کی اور بعض مقامات پر استہزائی انداز اختیار کرتے ہوئے لطیفہ گوئی اور چٹکلا بازی سے بھی کام لیا۔ حالی نے غالب کی اسی روش کی توجیہہ کی ہے۔ اس کے برعکس شیخ محمد اکرام کہتے ہیں کہ اگر غالب علمی بحث میں ذاتیات کو نہ لے آتے تو مخالفین اتنی سختی سے جواب نہ دیتے۔ مرزا غالب نے جہاں اختلاف کی صورت میں دلائل و براہین سے کام لیا وہیں قلم سے تیر و نشتر کا بھی کام لیا۔ غالب کے اس مزاج کا اعتراف کیے بنا مفر نہیں۔ قتیل کے لیے غالب نے جیسے نازیبا کلمات اپنے خطوط میں لکھے ہیں وہ بطور دلیل پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ قتیل کے معاملے میں اگر حامیان قتیل نے غالب کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کی بھی تھی تو اس میں قتیل کا کوئی قصور نہیں تھا۔ غالب نے قتیل کے ساتھ زیادتی کا آغاز کلکتہ سے ہی کردیا تھا، حالاں کہ اس وقت قتیل زندہ بھی نہیں تھے۔ قتیل کا قصور بس اتنا تھا کہ کلکتہ میں حاضرین مشاعرہ نے غالب کے اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے قتیل کی سند دے دی تھی۔ وہاں بھی غالب نے محض اعتراض کی بنا پر ہی قتیل کو ’’فرید آباد کا کھتری بچہ‘‘ کہہ کر مخاطب کیا تھا جس سے حسب نسب پر بے جا تفاخر کی بو آتی ہے۔ بہر حال کتاب کے منظر عام پر آتے ہی ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا اور ’’قاطع برہان‘‘ کے جواب میں سب سے پہلی کتاب ’’محرق قاطع برہان‘‘ مولفہ مولوی سید سعادت علی بہ زبان فارسی ۱۸۶۴ء میں مطبع احمدی، شاہدرہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں کل ۹۶ صفحات ہیں۔

''محرق قاطع برہان'' کے جواب میں تین کتابیں منظر عام پر آئیں:

۱۔ دافع ہذیان (فارسی) از مولوی نجف علی، ۲۸صفحات، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۵ء

۲۔ لطائف غیبی (اردو) از میاں دادخاں سیاح، ۴۱صفحات، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۵ء

۳۔ سوالات عبدالکریم (اردو) از عبدالکریم، ۸ صفحے، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۵ء

لطائف غیبی (میاں دادخاں سیاح) اور سوالات عبدالکریم (عبدالکریم) کے بارے میں قرائن سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ دونوں کتابیں غالب نے خود لکھ کر دوستوں کے نام سے شائع کروائی ہے۔

غالب کی ''قاطع برہان'' کے جواب میں بہ زبان فارسی دوسری کتاب ''ساطع برہان'' از مرزا رحیم بیگ میرٹھی، ۱۷۴صفحات، مطبع ہاشمی، میرٹھ، ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا جواب غالب نے اپنے ایک اردو خط بنام مرزا رحیم بیگ میں دیا۔ ۱۶صفحات پر مشتمل یہ خط ''نامۂ غالب'' کے عنوان سے ۱۸۶۵ء میں مطبع محمدی سے شائع ہوا۔ اب یہ خطوط غالب کے تمام مجموعوں میں شامل ہے۔

''قاطع برہان'' کے جواب میں ایک اور کتاب ''قاطع القاطع'' از امین الدین امین دہلوی، ۲۶۸ صفحات، مطبع مصطفائی، دہلی، ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ ''قاطع برہان'' کے جواب میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے لیکن شائع بعد میں ہوئی۔ اس کتاب کی زبان لچر اور فحش ہے، غالباً اسی وجہ سے غالب نے اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ بعد میں غالب نے مصنف کتاب پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیا۔ غالب دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام ہوگئے اور ناچار مقدمہ واپس لے لیا۔

غالب کے جواب میں ۴۶۸ صفحات پر مشتمل سب سے اہم اور وقیع کتاب ''موید برہان'' شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مصنف آغا احمد علی احمد جہانگیر نگری ہیں۔ ''موید برہان'' کی اشاعت ۱۸۶۶ء میں مطبع مظہر العجائب، کلکتہ سے عمل میں آئی۔ جب غالب کو اس کتاب کی خبر لگی تو انھوں نے فارسی زبان میں ۱۳۱ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ لکھا جو بعد میں ''سبد چین'' میں شامل کیا گیا۔ اس قطعے کے علاوہ غالب نے ۳۲صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ''تیغ تیز'' کے نام سے لکھا، جو ۱۸۶۷ء میں اکمل المطابع، دہلی سے شائع ہوا۔ اس رسالے میں ۱۷فصلیں ہیں۔ پہلی ۱۶فصلوں میں ''موید برہان'' کے اعتراضات کے جواب اور اپنے اعتراض درج ہیں۔ سترھویں فصل میں غالب نے ''برہان قاطع'' پر مزید اعتراض شامل کیے۔ ''تیغ تیز'' کے آخر میں ۱۶ادبی سوالات کا ایک استفتا بھی شامل ہے۔

مرزا غالب کے فارسی قطعہ کا جواب مولوی عبدالصمد فدا نے فارسی قطعہ لکھ کر دیا۔ غالب کی طرف سے فدا کے

فارسی قطعے کا جواب فارسی قطعے ہی میں سید محمد باقر علی باقر اور سید فخر الدین حسین سخن نے دیا۔ یہ چاروں فارسی قطعے ''ہنگامہ دل آشوب'' کے نام سے جمع کر دیے گئے۔ باقر اور سخن کے قطعوں کا جواب دوبارہ مولوی عبدالصمد اور منشی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی نے فارسی قطعہ لکھ کر دیا۔ فدا اور جوہر کے قطعوں کا جواب ایک بار پھر باقر اور سخن نے فارسی قطعہ لکھ کر دیا۔ اسی دوران ۲۵؍ جون ۱۸۶۷ء کے اودھ اخبار میں میر آغا علی شمس لکھنوی کا اردو میں ایک مضمون ''ایرادات بر اشعار مرزا غالب'' شائع ہوا۔ شمس لکھنوی کے ایرادات کا جواب فارسی نثر میں سید محمد باقر علی باقر اور اردو نثر میں سید فخر الدین حسین سخن نے دیا۔ علاوہ ازیں شمس لکھنوی کے جواب میں محمد امیر امیر لکھنوی نے اردو میں ایک قطعہ بھی لکھا۔ قطعہ فارسی فدا (دوم)، قطعہ فارسی باقر (دوم)، قطعہ فارسی سخن (دوم)، قطعہ فارسی جوہر، قطعہ اردو امیر، شمس لکھنوی کے اردو نثر میں غالب کے ایرادات، اس کے جواب میں باقر کی فارسی نثر اور اردو نثر میں سخن کا جواب ''ہنگامۂ دل آشوب حصہ دوم'' میں یکجا کر دیے گئے۔

اسی دوران غالب نے ''قاطع برہان'' پر مزید فوائد واعتراضات کا اضافہ کر کے ''درفش کاویانی'' کے نام سے مطبع اکمل المطابع، دہلی سے ۱۸۶۵ء میں چھپوایا۔ یہ کتاب کل ۱۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ احمد علی احمد جہانگیر نگری مولف ''موید برہان'' نے غالب کے رسالے ''تیغ تیز'' اور قاطع برہان کے نئے ایڈیشن ''درفش کاویانی'' کا جواب ''شمشیر تیز تر'' کے نام سے شائع کی۔ کتاب پر تاریخ طباعت ۱۸۶۸ء درج ہے لیکن یہ ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے غالب کا انتقال ہوگیا۔ یہ کتاب اس معرکے کی آخری کتاب ہے۔ اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی ''قاطع برہان'' نے ہندوستان بھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا اور ملک کے نامور علما وفضلا نے غالب سے اختلاف اور حمایت کی شکل میں زبان اور قواعد زبان کے تعلق سے گراں قدر نکات آشکار کیے۔

غالب کے طنز وتعریض اور تندلب ولہجے کے باوجود موضوع کے اعتبار سے ''قاطع برہان'' حق پر مبنی تھی۔ ''برہان قاطع'' پر غالب کے بیشتر اعتراضات درست تھے۔ بعض مقامات پر غالب سے بھی تسامحات سرزد ہوئے۔ بعد میں اکثر تسامحات کو غالب نے قبول کیا اور رجوع بھی کیا۔ فرہنگ ناصری مرتبہ رضا قلی خان ہدایت نے کئی مقامات پر غالب سے اتفاق کیا ہے۔ فرہنگ ناصری غالب کے انتقال کے بعد ایران سے شائع ہوئی تھی۔ تبریزی کی برہان قاطع کا ایک ایڈیشن تہران سے بھی شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن کے مرتب محمد معین نے بھی کئی مقام پر مرزا غالب کی تائید کی ہے۔ زبان دانی پر حد درجہ تفاخر اور ناز ایک دوسری بات ہے لیکن اس تفصیل سے غالب کی فارسی دانی اور اس زبان سے ان کی فطری مناسبت کا پختہ ثبوت ملتا ہے۔

نواب کلب علی خان سے چپقلش:

مرزا غالب رامپور کے نواب یوسف علی خان متخلص بہ ناظم کے استاد تھے۔ اپریل ۱۸۶۵ء میں یوسف علی خان کا انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ ان کے بڑے بیٹے نواب کلب علی خان والی رامپور قرار پائے۔ نواب کلب علی خان نہایت تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی میں شعر گوئی بھی کرتے تھے۔ یوسف علی خان کے زمانے میں غالب کے لیے جاری مشاہرہ نواب کلب علی خان کے عہد میں بھی برقرار رہا۔ اگست ۱۸۶۶ء میں مولوی محمد عثمان خان نے ''قصائد بدر چاچ'' کی شرح اور اس شرح پر نواب کلب علی خان نے فارسی نثر میں تقریظ لکھی۔ نواب صاحب نے یہ تقریظ بغرض اصلاح غالب کو ارسال کی۔ غالب نے نواب صاحب کی نثر میں ایسے الفاظ پر اصلاحیں دیں جو بیشتر ہندوستانی فارسی گویوں کی نظم ونثر میں عام ہیں۔ جب یہ اصلاح نواب کلب علی خان کے پاس پہنچی تو انھوں نے غالب کو جوابی خط لکھا۔ اس جوابی خط سے غالب کو مغالطہ ہوا اور انھوں نے اپنی عادت کے مطابق جواب میں ہندوستانی فارسی گویوں کے ناقابل اعتماد ہونے کا ذکر کردیا۔ غالب کے خط میں دو جملے ایسے تھے جو نواب صاحب کو نہایت گراں گزرے۔ وہ دونوں جملے حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں۔'' نواب صاحب نے غالب کے اس جملے کو تعریض پر محمول کیا۔

۲۔ ''بحث کا طریق یاد نہیں۔'' نواب صاحب نے اس جملے کے متعلق یہ خیال کیا کہ مرزا غالب افہام وتفہیم کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے یہ چاہتے ہیں کہ وہ جو کہیں میں بے چوں وچرا مان لوں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے نواب صاحب نے غالب کو لکھا کہ:

> ''مکتوب حیرت اسلوب مشعر اختراع معنی غلط نسبت ہندی نژادان پیشین و دیگر اعتراضہا و ایں کہ راقم را طریقۂ بحث یاد نیست، موصول مطالعہ گشتہ، باعث استعجاب عظیم گردید، از آں جا کہ تا حال ورائے تحقیق وتنقیح امور علمیہ کہ معاذ اللہ، از مناظرہ ومناقشہ چشم حس بیں بسا بعیدمی نماید۔''

اس کے جواب میں غالب نے یہی لکھا کہ ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی ہے میں ان میں کلام نہیں کرتا۔ ''اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہوں، اوروں سے مجھے بحث نہیں۔'' اس چشمک کے بعد نواب کلب علی خان نے پھر کبھی اپنی کوئی تحریر مرزا غالب کے پاس بغرض اصلاح نہیں بھیجی۔ ہندوستانی فارسی گویوں کو غیر مستند اور ناقابل اعتماد قرار دینے میں غالب تنہا نہیں ہیں بلکہ یہ قضیہ تو خان آرزو کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ غالب کا

قصور یہ ہے کہ ہندوستان میں پیدا ہونے کے باوجود خود کو مستند اور مسلم الثبوت تسلیم کروانے پر مصر تھے اور ایرانی نژاد شعرا جنھوں نے زبان کو ایران میں رہ کر سیکھا، جن کا مذاق شعر بھی ایران میں پروان چڑھا، انھیں صرف اس لیے نا قابل اعتبار گردانتے تھے کہ وہ وارد ہندوستان ہوئے۔

21.3.4 ماحصل

غالب اوائل عمری ہی سے بلا کے ذہین اور فارسی ادبیات سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ وہ سبک ہندی کے مشہور فارسی گو مرزا عبدالقادر بیدل کی طرز کے حد درجہ مداح تھے۔ وہ پیروی بیدل پر ابتدا ہی سے مائل تھے۔ بیدل کے اسلوب میں غزل کہنا کوئی معمولی بات نہیں، یہ ایک پیچیدہ طرز اسلوب تھا۔ بعد میں زمانے نے دیکھا کہ غالب نے اس طرز کو ایسی خوبی سے نبھایا کہ اردو میں خیال بند اسلوب غالب سے منسوب ہو گیا۔ اسی پیچیدہ گوئی کی وجہ سے غالب پر مہمل گوئی کا الزام لگایا گیا اور قیام دہلی کے ابتدائی زمانے میں بعض دہلوی شعرا نے ان کے کلام کا مذاق بھی اڑایا۔ لیکن غالب کو اصل معرکہ کلکتے میں پیش آیا۔ جہاں انھوں نے ایک غزل پڑھی اور اس غزل کے ایک شعر پر اعتراض یہ کہہ کر کیا گیا کہ بہ سند قتیل درست نہیں۔ معترضین کی طرف سے قتیل کی سند کیے جانے پر غالب نے قتیل کے لیے نازیبا اور پر حقارت لہجہ اپنایا جو معتقدین قتیل کو نہایت گراں گذرا۔ اس معرکے کی گونج کلکتے کے گلی کوچوں تک سنائی دی۔ کلکتے کے اس معرکے کی وجہ سے غالب کے دل میں قتیل اور ہندوستانی فارسی گویوں کے لیے بے وقعتی بڑھ گئی اور تا عمر غالب ہندوستانی فارسی گویوں نا قابل اعتنا سمجھتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد غالب کی کتاب ’’قاطع برہان‘‘ شائع ہوئی۔ اس کتاب نے پورے ملک میں آگ لگا دی۔ یہ کتاب دراصل ’’برہان قاطع‘‘ از محمد حسین تبریزی کی فروگذاشتوں کی نشاندہی اور تصحیح پر مشتمل تھی۔ لیکن ہنگامے کا اصل سبب ہندوستانی فارسی گویوں کے لیے غالب کا تند و تیز اور حقارت آمیز لہجہ تھا۔ غالب کی کتاب کے جواب میں چار کتابیں محرق قاطع برہان، ساطع برہان، قاطع القاطع اور موید برہان شائع ہوئیں۔ بعد میں غالب نے مزید اضافوں اور ترتیب کے ساتھ ’’قاطع برہان‘‘ کو ’’درفش کاویانی‘‘ کے نام سے شائع کیا۔ موید برہان کے جواب میں غالب نے ’’تیغ تیز‘‘ کے نام سے رسالہ تحریر کیا۔ مصنف موید برہان احمد علی جہانگیرنگری نے ’’درفش کاویانی‘‘ اور ’’تیغ تیز‘‘ کا جواب ’’شمشیر تیز تر‘‘ لکھ کر دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس پورے قضیے میں غالب کے بیشتر ایرادات مبنی بر حق تھے۔ البتہ کئی جگہوں پر خود غالب کے اعتراض بھی تسامح کی وجہ سے تھے۔ اس معرکے نے غالب کی فارسی دانی اور فارسی زبان سے ان کی فطری مناسبت کو ثابت کر دیا۔ ’’شرح بدر چاچ‘‘ پر نواب کلب علی خان کی فارسی میں لکھی گئی تقریظ کی وجہ سے کچھ چپقلش غالب اور نواب کلب علی خان کے درمیان بھی ہو گئی تھی۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ غالب ہندی فرہنگ لکھنے والوں سے کلام نہیں کرتے اور اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہیں۔

21.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- معرکوں کی غرض و غایت اور اس کی اقسام سے واقفیت حاصل کی۔
- ادبی معرکوں کی روایت اور مقابلے، معرکے، مسابقے کے مابین افتراق کو جانا۔
- غالب کے ادبی معرکوں کے موضوعات اور صورت حال کا ادراک کیا۔
- غالب کے مختلف النوع ادبی معرکوں اور چپقلشوں سے آگہی حاصل کی۔
- مختلف النوع ادبی معرکوں کے ذریعے غالب کی فارسی دانی اور زبان دانی کی معلومات حاصل کی۔

21.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ ادبی مقابلے، ادبی مباحثے اور ادبی معرکے کے مابین فرق کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ ادبی معرکوں کی مختلف قسموں پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

۳۔ غالب کے ساتھ شعرائے دہلی کی چھیڑ چھاڑ، کو بیان کیجیے۔

۴۔ کلکتہ کے معرکے میں غالب کے دو فارسی اشعار پر کیے اعتراضات بیان کیجیے۔

۵۔ قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی تحریروں کے نام مع مولفین درج کیجیے۔

21.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ کسی خاص موقعے پر مختلف شعرا ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنی تخلیقات پیش کریں اور حکم ان کی تخلیقات پر فیصلہ صادر کرے تو یہ صورت ادبی مقابلہ کہلاتی ہے۔ جس شاعر اور ادیب کے حق میں حکم فیصلہ کردے وہ بڑا شاعر تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ جب فریقین ایک طے شدہ موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں اور اس کے تمام ابعاد اور مختلف پہلوؤں پر بحث و مباحثے کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس صورت کو ادبی مباحثہ کہتے ہیں۔ کبھی فریقین ایک دوسرے سے متفق ہوجاتے ہیں اور کبھی ان کے درمیان اختلاف قائم رہتا ہے۔ اختلاف کی صورت میں مباحثہ اخبارات اور رسائل کی صورت میں جاری رہتا ہے۔ ادبی مقابلے اور ادبی مباحثے کے نتیجے میں مخصوص ادبی موضوعات و مسائل کے مختلف ابعاد سامنے آتے ہیں اور امکان کی نئی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ یہی فوائد ادبی معرکوں سے بھی حاصل ہوتے ہیں لیکن جب اختلاف رائے میں شدت پیدا ہوجاتی ہے تو اختلاف ذاتیات پر رکیک حملوں میں

تبدیل ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ادبی اور لسانی مسائل پر کارآمد نکات سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ادبی معرکے اختلاف رائے میں شدت، مخاصمت، بے اعتدالی، عیب جوئی اور طعنہ زنی کو بھی راہ دیتے ہیں۔

۲۔ ادبی معرکے چار قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابلے پر سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کلام کی تنقیص وتعریض کرنے کے ساتھ ساتھ معترضین کے اعتراضات کا جواب بھی دیتے ہیں۔ دوسری قسم یہ ہے کہ ایک فریق دوسرے پر ایراد کرتا ہے اور دوسرا فریق اس پر خاموش نظر آتا ہے۔ اس صورت میں دو باتیں امکانی ہیں۔ ایک امکان تو یہ ہے کہ دوسرا فریق پہلے فریق کے اعتراضات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا اور خاموش رہتا ہے یا پھر وہ پہلے فریق کے ایرادات اور اعتراضات کی تاب نہ لاکر سکوت اختیار کرتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ دوسرے فریق کی جوابی کاروائی محفوظ نہ رہ سکی اور دست برد زمانہ ہوگئی۔ تیسری قسم یہ ہے کہ کسی شاعر نے معاصرین میں خود کو ممتاز اور قادر الکلام ثابت کرنے کے لیے ماقبل کے کسی مشہور اور استاد زمانہ شاعر کے کلام میں نقائص اور عیوب کی نشاندہی کی۔ استاد شاعر کی طرف سے ایرادات کا جواب دینے کے لیے اس کے تلامذہ اور موئدین میدان میں آگئے۔ قدیم دور میں طرحی مشاعروں کا خاصا چلن تھا۔ ان طرحی مشاعروں میں شعرا ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر کمال فن کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کوشش میں شعرا کے درمیان ایک قسم کی خاموش جنگ جاری رہتی تھی۔ اس صورت کو ادبی معرکے کی چوتھی قسم کہا جاتا ہے۔

۳۔ غالب کے ساتھ شعرائے دہلی کی چھیڑ چھاڑ کا پہلا واقعہ خدائے سخن میر تقی میر کا ہے۔ میر کے قیام لکھنؤ کے دوران انھیں غالب کا کلام دکھایا گیا۔ اس کلام پر میر نے یہ رائے دی کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھی راہ پر ڈال دیا تو کمال کا شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل یعنی لایعنی بکے گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے کلام کو ابتدا میں مہمل سمجھا گیا۔ بعد کے دو واقعات شعرائے دہلی کی اسی سوچ کو ظاہر کرتے ہیں۔ دہلی کے ایک مشاعرے میں حکیم آغا جان عیش نے اپنی ایک غزل کے قطعہ بند اشعار پڑھے جس کے نشانے پر غالب کی زبان اور ان کا اسلوب بیان تھا۔ قطعہ حسب ذیل ہے:

زبان میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر اون کی زبان وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے
اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے تم کہو اور دوسرا سمجھے

ایسا ہی ایک واقعہ مولوی عبدالقادر رامپوری کا ہے جو قلعۂ معلیٰ سے بھی وابستہ رہے۔ ایک دن انھوں نے دو مصرعے فی البدیہہ موزوں کر کے مرزا غالب کو یہ کہہ کر سنایا کہ یہ شعر میں نے آپ کی غزل میں خود دیکھا ہے سنایا اور شعر کے حوالے سے مفہوم کے طالب ہوئے:

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

درج بالا شعر غالب کا نہیں۔ غالب نے اس کی تردید بھی کی۔ بالآخر غالب عبدالقادر رامپوری کا مقصود سمجھ گئے کہ وہ ان کے اشعار کو مہمل اور لایعنی نیز غالب کو مہمل گو قرار دے رہے ہیں۔

۴۔ کلکتے میں واقع مدرسۂ عالیہ کے ایک مشاعرہ میں غالب نے اپنی ایک غزل پیش کی جس کا ایک شعر حسب ذیل ہے:

جزوے عالم از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

درج بالا شعر پر یہ اعتراض کیا گیا کہ پہلے مصرعے میں ’ہمہ عالم‘ کی ترکیب غلط ہے۔ ’ہمہ‘ جمع اور ’عالم‘ واحد ہے۔ جمع اور واحد کا یہ اجتماع قتیل کے اجتہاد کی رو سے غلط ہے جائز نہیں۔ دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ ’’بیشم‘‘ کی جگہ ’’بیشترم‘‘ کہنا چاہیے تھا۔ اور تیسرے اعتراض کی رو سے دوسرے مصرعے میں مستعمل ’’موئے ز میاں‘‘ کی ترکیب بھی غلط ہے۔

غالب کی ایک اور فارسی غزل کے ایک شعر پر اعتراض کیا گیا کہ اس میں ’’ردیف زدۂ بہمزہ‘‘ کا استعمال غلط ہے۔ غالب کا فارسی شعر حسب ذیل ہے:

شور اشکے بفشار بُن مژگاں دارم
طعنہ بر بے سرو سامانی طوفاں زدۂ

۵۔ قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی تحریروں کے نام مع مولفین حسب ذیل ہیں:

۱۔ محرق قاطع برہان از مولوی سید سعادت علی
۲۔ ساطع برہان از مرزا رحیم بیگ صاحب میرٹھی
۳۔ قاطع القاطع از امین الدین امین پٹیالہ
۴۔ موید البرہان از مولوی آغا احمد علی جہانگیر نگری

21.7 فرہنگ

(الفاظ)	(معنی)
ایراد	اعتراض، نکتہ چینی، وارد کرنا
مہمل	لایعنی، فضول، لغو، بے سروپا
ابعاد	لمبائی، چوڑائی، گہرائی، فاصلے، دوریاں
رکیک	گھٹیا، ادنی، مبتذل، تہذیب سے گرا ہوا، پتلا
مخاصمت	دشمنی، عداوت، جھگڑا
حَکَم	جج، منصف، فیصلہ کرنے والا، ثالث
قضیہ	جھگڑا، مقدمہ، آپسی نزاع
ایرانی نژاد	ایرانی نسل کا
چشمک	چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک، طعن و تشنیع
تقریظ	کسی دوسرے کی کتاب پر تعریفی اور تائیدی رائے دینا۔ یہ رائے کتاب کی ابتدا یا اختتام پر شامل ہوتی ہے۔

21.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ یادگار غالب	الطاف حسین حالی
۲۔ قتیل اور غالب	سید اسد علی فرید آبادی
۳۔ غالب کے ادبی معرکے ('نقوش' ادبی معرکے نمبر)	مالک رام
۴۔ اردو کے ادبی معرکے (انشا سے غالب تک)	محمد یعقوب عامر
۵۔ غالب اور کلکتہ	مرتبہ شاہد ماہلی
۶۔ اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (ابتدا سے عہد مرزا و میر تک)	محمد یعقوب عامر

اکائی 22 غالبؔ کے نمائندہ معاصرین

ساخت

22.1 اغراض و مقاصد
22.2 تمہید
22.3 غالبؔ کے نمائندہ معاصرین
  22.3.1 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ
  22.3.2 مفتی صدرالدین آزردہؔ
  22.3.3 مولانا امام بخش صہبائیؔ
  22.3.4 میرزا ہرگوپال تفتہؔ
  22.3.5 مومن خان مومنؔ
  22.3.6 نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ
  22.3.7 بہادر شاہ ظفرؔ
  22.3.8 ماحصل
22.4 آپ نے کیا سیکھا؟
22.5 اپنا امتحان خود لیجیے
22.6 فرہنگ
22.7 سوالوں کے جوابات
22.8 کتب برائے مطالعہ

22.1 اغراض و مقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- غالبؔ کے نمائندہ معاصرین کے حالات زندگی سے متعارف ہوں گے۔
- غالبؔ کے نمائندہ معاصرین کی ادبی خدمات سے روشناس ہوں گے۔
- غالبؔ کے نمائندہ معاصرین کے کلام کی فکری و فنی خوبیوں سے واقف ہوں گے۔
- غالبؔ کے نمائندہ معاصرین کے مقام و مرتبہ سے آگاہ ہوں گے۔
- غالبؔ کے عہد کی شاعری سے واقف ہوں۔

22.2 تمہید

عزیز طلبا! آپ نے پچھلی اکائی میں غالب کے ادبی معرکوں کے متعلق تفصیل سے مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ سے غالبؔ کے ادبی معرکوں کی نوعیت، بنیادی محرکات اور معرکوں کی تفصیلات کا علم ہوا۔ اب آپ اس زیر مطالعہ اکائی میں غالب کے نمائندہ معاصرین کے تحت شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، مفتی صدر الدین آزردہؔ، مولانا امام بخش صہبائیؔ، میرزا ہرگوپال تفتہؔ، مومن خان مومنؔ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کے متعلق پڑھیں گے۔ ان میں سے کئی معاصرین کے ساتھ غالب کے دوستانہ تعلقات تھے اور کئی ایک کے ساتھ ادبی رقابت تھی لیکن دونوں طرف احترام واعتراف کا سلیقہ موجود تھا۔ یہ نقطہ ذہن میں رہے کہ غالب کے معاصرین میں نثار اور شاعر دونوں ہیں۔ جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ لہٰذا یہاں پر صرف مختلف النوع فکر وذہن کے چند اہم معاصرین کو ہی منتخب کیا گیا ہے، تا کہ طوالت کے بغیر عہدِ غالب کے ادبی رجحان کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

22.3 غالبؔ کے نمائندہ معاصرین

غالبؔ کے معاصریں میں منشی نبی بخش حقیر، میاداخاں سیاح، غلام بابا جان، منشی بہاری لال مشتاق، منشی شیونارائن آرام، منشی ہیرا سنگھ، منشی امید سنگھ، سید محمد صالح، لالہ گوبند سنگھ، سید باقر حسین، سید فضل علی، نواب قطب الدین خاں، سید ظہیر الدین، خواجہ بدر الدین، مولوی ضیاء الدین، ظہیر الدین دہلوی، کریم الدین، نواب ضیا الدین نیر، عبداللہ علوی حسرتی، شاہ نصیر الدین نصیر، رام چندر، امام بخش، سبحان بخش، کریم بخش، محمد بخش، مولوی احمد علی، غلام امام شہید، غلام غوث، عبدالغفور سید اولاو علی، عبدالرزاق، مسٹر ٹیلر، سید علی، پنڈت اجودھیا پرشاد، منشی حسینی، میر سید محمد، شیخ محمد ضیاء الدین، پیر خان، پنڈت سری کرشن، مصطفیٰ خاں، سید جمیل، سید محمد صادق، سید عبدالقادر، میر حیدر علی، مولوی محمد احسن، مولوی سیف الحق، حکیم غلام رضا خاں، حکیم غلام نبی، میر فخر الدین، سردار نین سنگھ، امین الدین، قمر الدین، سید حسن، مرتضیٰ خاں، پیارے لال آشوب، امراو خان، نظیر علی، مولوی عبدالرحیم، سید نصیر علی، سید میر حسن رضوی، منشی مراری لال، مہادیو چھتہ صوفی جی، منشی مہانرائن، منشی نول کشور، بال مکند بے صبر، شیو نارائن آرام، منشی جواہر سنگھ، امید سنگھ، منشی ہرگوپال تفتہ، میر مہدی مجروح، مفتی صدر الدین آزردہ، مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا فضل الحق خیر آبادی، خواجہ الطاف حسین حالی، سر سید احمد خاں، میر امداد علی خاں، محمد ممتاز علی خاں، مولوی غلام امام شہید، عبدالواسع، خواجہ غلام غوث، چودھری عبدالغفور سرور، حسین علی خان شاداں، غیاث الدین، عطا حسین عطا، میر نظام الدین ممنون، حکیم عبدالرحیم خاں، قاضی محمد صادق اختر، مولوی سراج الدین قتیل، بہادر شاہ ظفر، شیخ محمد ابراھیم ذوق، مومن، خان مومن، امام بخش صہبائی، رجب علی بیگ سرور وغیرہ شامل ہیں۔ جن میں سے چند معاصرین کی تفصیل درج ذیل ہے۔

22.3.1 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

نام محمد ابراہیم، ذات شیخ اور تخلص ذوقؔ تھا۔ ان کا آبائی وطن قصبہ شاہ پور، تحصیل بڑھانہ، ضلع مظفر نگر تھا۔ ان کے والد شیخ محمد رمضان یہاں سے دہلی میں جا بسے تھے۔ ذوق کی ولادت ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۷۸ء میں ہوئی اور ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۴ء کو انتقال ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم غلام رسول شوق کے مکتب میں حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی میاں عبدالرزاق سے درسیات کی تکمیل کی۔ ان ہی کے مدرسے میں آزاد کے والدِ ماجد مولوی محمد باقر سے ملاقات ہوئی۔ ابتدا میں وہ شوق سے اصلاح لینے لگے اور ان کے مشورے سے ذوقؔ تخلص اختیار کیا۔ ان کے بعد وہ شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے لیکن ان کی طرف شاہ نصیر کی توجہ کم رہتی تھی۔ جو غزلیں ذوق اصلاح کے لیے لاتے تھے شاہ نصیر انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیتے تھے کہ ”طبیعت پر خوب زور ڈالو اور مزید غور و فکر کرو“۔ ذوق ان سے دل برداشتہ ہوتے تھے، لیکن دوست و احباب ہمت بندھاتے اور مشاعروں میں پڑھنے کا مشورہ دیتے۔ اس طرح ذوق کی مشقِ سخن جاری رہا۔ شاہ نصیر اور ذوق کے درمیان چشمک بھی خوب رہتی تھی۔ جب شاہ نصیر حیدر آباد چلے گئے تو ان کے کچھ شاگرد ذوق سے اصلاح لینے لگے جن میں نواب الٰہی بخش خاں معروف خاص کر قابلِ ذکر ہیں جن کی وجہ سے ذوق کو شہرت ملی۔ وہ بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی کے ساتھ ہی قلعے سے وابستہ ہو گئے تھے۔ شاہ نصیر نے میر محمد کاظم کے لیے قلعے میں جانے کا موقع فراہم کیا تھا انہوں نے یہ موقع ذوق کے لیے فراہم کیا۔ بادشاہ کی طرف سے انہیں ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ شاہ نصیر کے سلسلے سے وابستہ ہونے کی بنا پر ذوق کا رنگِ سخن دلی پر حاوی ہو گیا اور بادشاہ کا استاد ہونے کہ وجہ سے بھی کئی شعرا ان سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ذوق کا مطالعہ واقعی وسیع تھا۔ ان کی شاعری میں فکر کی آمیزش تو ہے لیکن یہ بے ساختہ اور ثقیل ہے۔ اندازِ بیان سادہ تو ہے لیکن سپاٹ ہے جہاں لفظوں کو جوڑ کر شعر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذوق دراصل قصائد کے شاہ سوار ہیں۔ سودا کے بعد قصیدہ نگاری میں ان ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ قصیدہ چوں کہ مدح ستائی پر مبنی صنف ہے لہٰذا اس میں شاعر زبان دانی کی دھاک بٹھانا چاہتا ہے۔ ذوق کی شاعری میں اسی زبان دانی کی دھاک ملتی ہے جو اس دور کا ایک اہم رجحان تھا اسی وجہ سے وہ اس دور کے اہم شعرا میں تسلیم کیے جانے لگے۔ نمونہ کلام دیکھیے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
وقت پیری شباب کی باتیں　　ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
خوب روکا شکایتوں سے مجھے　　تو نے مارا عنایتوں سے مجھے
مرضِ عشق جسے ہو اسے کیا یاد رہے　　نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے
عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو　　یہ عمرِ رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو
گہر کو جوہری، صراف زر کو دیکھتے ہیں　　بشر کے ہیں جو مبصر بشر کو دیکھتے ہیں

22.3.2 مفتی صدرالدین آزردہؔ

مفتی صدرالدین آزردہؔ غالب کے اہم معاصرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام لطف اللہ تھا جو اصلاً کشمیری تھے۔ انہی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مفتی صاحب نے مولانا فضل امام ابن مولانا فضل حق خیر آبادی سے کتبِ معقولات اور مولانا رفیع الدین سے علومِ شرعیہ کی تعلیم حاصل کی۔ اور مولانا عبدالعزیز کی صحبت سے بھی فیض یاب ہوئے۔ مولانا محمد اسحاق سے حدیثِ مبارکہ کی سند حاصل کی خطاطی اور خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے استاد رہے ہیں۔ شیفتہ ان کو افضل الفضلا اور اعلم العلما کے خطابات سے یاد کرتے تھے۔ سرسید احمد خان، نواب یوسف علی خان والئی رام پور، نواب صدیق حسن خان اور مولانا گنگوہی ان کے شاگرد رہے ہیں۔ سرسید ان کو کاشفِ دقائق، واقفِ حقائق، درویش سیرت، ملک سیرت اور مرجع جہانیان قرار دیتے ہیں۔ آزردہ کو سہلِ ممتنع کے بنیاد گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے غالب کو خوش گفتاری، سادگی، سلاست اور روانی کی راہ دکھلائی۔ جس زمانے میں مفتی صاحب عدالت کیا کرتے تھے کہ اس دوران غالب مقروض ہوگئے اور قرض خواہوں نے ان پر مقدمہ دائر کیا جب مفتی صاحب کی عدالت میں پیش ہوئے تو اپنا شعر:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

سنایا، یہ شعر سن کر مفتی صاحب مسکرائے اور اپنے پاس سے ان کا قرض ادا کیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے پر آپ نے دستخط کیے تھے جس کی پاداشت میں چھ مہینے کی قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑی اور انگریزوں نے انھیں ملازمت سے نکال دیا جس کی وجہ سے فاقہ کشی تک کی نوبت آئی۔ مزید برآں زمین و جائداد کو بھی نیلام کر دیا، تین لاکھ لاگت تک کا کتب خانہ تلف کر دیا، اس افراتفری میں ان کا اردو و فارسی کا کلام بھی کہیں گم ہو گیا۔ وہ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ دہلی میں اہلِ کمال عام طور پر تین جگہ اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور مفتی صدرالدین آزردہ کے گھر پر۔ مفتی صاحب کا گھر ہر حال میں اہلِ علم کا مرکز تھا۔ غالب اور آزردہ میں آپسی چشمک کے باوجود دوستانہ مراسم قائم تھے۔ غالب کے کچھ فارسی خطوط آزردہ کے نام ہیں اور اکتالیس اشعار کا ایک فارسی قصیدہ بھی انہوں نے ان کے نام لکھا ہے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ وہ شاہ نصیر، میاں مجرم اکبر آبادی اور ممنون کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ شگفتگی، شادابی، روانی، برجستگی، شوخی، بانکپن، نرمی، گداز، شیرینی، حلاوت، سادگی و پرکاری ان کے کلام کی بنیادی خوبیاں ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
آزردہ مر کے کوچہ جاناں میں رہ گیا — دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے
اس درد جدائی سے کہیں جان نکل جائے — آزردہ مرے حق میں ذرا یوں بھی دعا کر
کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شب فراق — شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں
فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے ہی طور — کہ اپنے کیے پر پشیماں نہیں
میں اور ذوق بادہ کشی لے گئیں مجھے — یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

22.3.3 مولانا امام بخش صہبائی

امام بخش نام اور صہبائی تخلص تھا۔ ان کی ولادت ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں ہوئی۔ صہبائی کو معمائی بھی کہا جاتا ہے۔ ان کو فنِ معما سے بہت لگاؤ تھا اور اس فن میں وہ کافی مہارت رکھتے تھے اسی نسبت سے ان کا نام صہبائی معمائی بھی پڑ گیا تھا۔ ان کے آبا و اجداد تھانیسر سے دہلی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ان کے والدِ مکرم اپنے دور کی نامور شخصیات میں شمار ہوتے تھے اور شہر کی معزز شخصیات سے ان کے مراسم تھے اس لیے ان کے دونوں بیٹوں کو دہلی کے بہترین اساتذہ سے تحصیلِ علم کا موقع ملا۔ خاص طور پر مولوی عبداللہ خان علوی سے انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے بعض امیر گھرانوں میں مدرسی و اتالیقی کے فرائض انجام دیے۔ محمد ذاکر حسین کے مطابق صہبائی کی علمیت اور فارسی دانی عروج پر پہنچنے کے سبب غالب ان سے خار کھاتے تھے۔ لیکن صہبائی خود کو اس سے بچاتے رہے۔ دونوں میں علمی معاملات میں نوک جھونک بھی رہتی تھی۔ وہ غالب کو ایرانیوں کے برابر سمجھتے رہے۔

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

شاعری کے معاملے میں غالب، صہبائی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں کی داروگیر کی زد میں صہبائی کا پورا خاندان آ گیا جس میں ۲۱ افراد شامل تھے۔ حتیٰ کہ اپنے دو بیٹوں سمیت ظالموں کی گولیوں کا لقمہ بن گئے۔ اکبر الہ آبادی نے جس کی طرف اشارہ کیا ہے:

وہی صہبائی جو تھے صاحبِ قولِ فیصل
ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

مولانا صہبائی فارسی زبان و ادب کے ایک اہم عالم تھے۔ لہٰذا ان کی زیادہ تخلیقات اسی زبان میں ہیں۔ اس زبان میں انہوں نے گراں قدر ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ قولِ فیصل، شرح معمای ہمدانی، شرح نصیرای ہمدانی، ترجمہ حدایق البلاغت، انتخاباتِ نظم، قواعدِ اردو کے علاوہ انہوں نے کئی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ لطافتِ بیان، ندرتِ ادا، جدتِ مضامین، اور پختگی ان کے کلام کی خوبیاں ہیں۔ نمونۂ کلام آپ کے پیشِ نظر ہے:

بار غم کا اٹھانا ہی پڑا آہ
داغ ہجر کا کھانا ہی پڑا آہ

تجھے اور تیرے دشمن کو سدا ہے اوج عالم میں
تجھے تخت سیاست پر اسے دار سیاست پر

22.3.4 میرزا ہر گوپال تفتہؔ

میرزا ہر گوپال تفتہ کی پیدائش ۱۷۹۹ء کو محلّہ قانون گویان، سکندر آباد ضلع بلند شہر میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام موتی لال کائستھ تھا۔ ابتدائی تعلیم والدِ محترم سے ہی حاصل کی۔ بقیہ تعلیم دوسرے اساتذہ سے حاصل کر کے انگریزی حکومت کے محکمہ بندوبست میں قانون گو کی حیثیت سے ملازمت کی۔ بعدازاں اس ملازمت کو ترک کر کے جے پور میں ملازم ہو گئے لیکن شاعری کے شوق میں اس کو بھی چھوڑ دیا۔ ۱۸۷۹ء میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ مرزا محمد حسن قتیل سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد انہوں نے غالب کی شاگردی اختیار کی۔ پہلے وہ رامی تخلص کرتے تھے، غالب نے بدل کر تفتہؔ رکھا اور مرزا کا خطاب عطا کیا۔ غالب ان کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ۱۲۳ یعنی سب سے زیاہ خطوط تفتہ کے نام ہی بھیجے ہیں اور ان کی مدت تقریباً بیس سال پر محیط ہے۔ ان میں زیادہ تر خطوط شعری اصلاحات سے متعلق ہیں۔ ان میں تنبیہ، مشورہ، پیار اور محبت غرض ہر طرح کی اصلاحات شامل ہیں۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ 'خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں پس تمہارے نتائجِ طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔' غالب نے ان کو اپنے خطوط میں بہت سے مشفقانہ القاب سے بھی نواز ہے۔ تفتہ کی شاعری کا معتدد حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ زیادہ تر تقلیدی غزلیں ہیں، جن میں جدت وندرت کی کمی جھلکتی ہے۔ ان پر سب سے زیادہ اثر مرزا جلال اسیرؔ کا ہے۔ انہوں نے سعدی کی بوستان کی پیروی میں اخلاقیات پر مبنی مثنوی سنبلستان لکھی ہے۔ اس کا نام بھی غالب کے مشورے پر رکھا۔ اس میں تیرہ ابواب ہیں۔ ان کی ایک اور کتاب تضمینِ گلستان ہے۔ جسے انہوں نے اپنے چھوٹے لڑکے پیتمبر سنگھ کی یاد میں لکھا ہے جو ان کی زندگی میں ہی وفات پا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے گلستانِ سعدی کے آٹھ ابواب کی تضمین کی ہے۔ انہوں نے اپنی اکثر تصنیفات میں فارسی کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ نمونۂ کلام دیکھیے:

تفتہؔ خاموش است و می گوید اسیر
کار خاموشی بہ غوغا می رسد

باز این چہ مژدہ است کہ عرفیؔ بہ تفتہؔ داد
باز این چہ ناوک است کہ عشق از کمین ز داست

گفتم آمد شیخ چون اندر سجود
کار ساز ہاے شیطان بر طرف

نام من ہم پیشۂ من گو مبر
شعر من در ہر ولایت می برند

22.3.5 مومن خان مومنؔ

ذوقؔ کے بعد غالبؔ کے معاصرین میں مومن خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ نام حکیم مومن خان اور تخلص مومنؔ تھا۔ ۱۸۰۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم شاہ عبدالقادر صاحب کے مدرسے میں پائی۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے درس میں بھی شرکت کرتے تھے۔ اور فارسی زبان کی تعلیم عبداللہ خان علوی سے حاصل کی۔ اپنے خاندانی پیشے طب کی تعلیم اپنے والدِ ماجد غلام نبی خان اور چچا غلام حیدر خان سے لی۔ مومن نجوم، عملیات، رمل، جعفر، موسیقی، شطرنج، اور ریاضی میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ بہت سا وقت عشق و عاشقی اور عیش پرستی میں گزارا، لیکن ۱۸۰۳ء میں سید احمد شہید کی بالاکوٹ میں شہادت کے واقعے نے ان کی زندگی کو بدل دیا اور موسیقیت سے توبہ کر کے صوم وصلاۃ کے پابند ہو گئے۔ اور ۱۸۵۱ء میں وفات پائی۔

کلب علی فائق کے بقول نو برس کی عمر میں انہوں نے شاعری شروع کی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لیکن جب ناسخ کا کلام دلی پہنچا تو ان کی طرف اور بعد میں میر کی طرف مائل ہوئے۔ مومن بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ لیکن بقیہ شعرا کی طرح انہوں نے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی اور واسوخت میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی غزل میں تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرتِ اسلوب، مکرِ شاعرانہ جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ان کی غزل کے مضامین حسن وعشق کے معاملات کے گرد گھومتے ہیں۔ انہوں نے اس میں نسوانی پیکر کو پیش کیا جس کا ذکر ان کی غزل میں 'پردہ نشین' کے عنوان سے ملتا ہے۔ معاملہ بندی میں مومن کی غزلیں بڑی خصوصیات کی حامل ہیں۔ حسینوں سے چھیڑ چھاڑ، رقیب سے اپنے رویے کا اظہار، وصل وہجر کی داستان معاملہ بندی میں بیان کی جاتی ہے۔ اسی طرح نازک خیالی بھی مومن کی غزل کی اہم خصوصیت ہے۔ انہوں نے اس نازک خیالی میں ندرتِ اسلوب اور شاعرانہ شوخی کو استعمال کیا ہے۔ مکرِ شاعرانہ کے لیے بھی مومن جانے جاتے ہیں۔ اس صنعت کو انہوں نے خوبی سے بھرتا ہے۔ انہوں نے تشبیہات واستعارات اور صنائع وبدائع کو بھی خوبی سے نبھایا ہے۔

مومن نے چھ مثنویاں 'شکایتِ ستم، قصہ غم، قولِ غمیں، تفِ آتشیں، حنینِ مغموم، آہ زار، مظلوماں' لکھیں ہیں۔ ان

تمام مثنویوں کے موضوعات عاشقانہ ہیں۔ ان کے قصائد کی تعداد نو ہے جو زیادہ تر مذہبی شخصیات پر مبنی ہیں۔ مومن کی فکر کا دائرہ و محور محدود ہے۔ اسلم پرویز نے یہ بات صحیح لکھی ہے کہ ''مومن کی شاعری کا صرف ایک پہلو ایسا ہے جہاں وہ شعرائے متقدمین اور ہم عصر شعرا سے ممتاز نظر آتے ہیں اور وہ ہے ان کی عشقیہ شاعری۔''

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس شعر کے بارے میں مشہور ہے کہ غالب نے کہا تھا کہ اگر مومن مجھے یہ شعر دیں تو میں اپنا پورا دیوان دے دوں گا۔ نمونۂ کلام:

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

کیا جانے کیا لکھا تھا اسے اضطراب میں
قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں

نہ کرو اب نباہ کی باتیں
تم کو اے مہربان دیکھ لیا

ہو گیا راز عشق بے پردہ
اس نے پردہ سے جو نکالا منہ

ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بے قرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

22.3.6 نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ

نام نواب محمد مصطفیٰ خان اور تخلص شیفتہؔ تھا۔ ان کی پیدائش ۱۸۰۶ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام نواب مرتضیٰ خاں تھا، جن کو بہادر مظفر جنگ کا خطاب ملا تھا۔ انھوں نے رواجِ زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر لی۔ میاں جی مالا مال سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا حاجی محمد نور دہلوی نقشبندی سے فنِ حدیث و تجوید میں استفادہ کیا۔ حج کے دوران شیخ عبداللہ سراج حنفی سے مکہ معظّمہ میں صحاح کے ابتدائی حصے تبرکاً پڑھے اور شیخ محمد عابد سندھی سے بھی استفادہ کیا اور روایت کرنے کی اجازت ملی۔ ان کے علاوہ شاہ غلام علی دہلوی کے خلیفہ

مولوی کرم اللہ سے کچھ علوم پڑھے۔ وہ فرائض کے علاوہ نوافل کی پابندی بھی کرتے تھے اور تہجد کا خاص طور پر اہتمام کرتے تھے۔ ان کا شمار دہلی کے روسا اور جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے تعلقہ داروں میں ہوتا تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران ٹھاکروں نے ان کے قلعہ جہانگیر آباد پر قبضہ کیا اور ان کے محلوں کو آگ لگائی۔ گھر کا ساز و سامان جلنے کے ساتھ ساتھ ان کا کتب خانہ بھی جل گیا، جس میں ان کی اپنی تصانیف اور اردو فارسی کلام بھی آگ کی نذر ہو گیا۔

شیفتہؔ نے مومن خان مومن سے شاعری کی اصلاح لی۔ اردو میں شیفتہؔ اور فارسی میں حسرتیؔ تخلص اختیار کرتے تھے۔ انہوں نے سولہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ اور اکیس سال کی عمر میں دیوان مرتب کر کے مطبع آئینہ سکندری سے چھپایا تھا۔

اے شیفتہ اس فن میں ہوں اک پیرِ طریقت
گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی

ان کا فارسی کلام حمد، تصوف، حکمت، اخلاق اور محبت کے مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ ان کے اردو کلام میں گرمی اور لذت کے علاوہ شکوہِ الفاظ اور چست ترکیب بھی پائی جاتی ہے۔ وہ قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسالیب کو لفظی اور معنوی تصرف کے ساتھ ایک نئے سانچے میں ڈھالتے تھے۔ ان کے کلام میں سنجیدگی اور متانت کا خاص لحاظ پایا جاتا ہے۔ بطور نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہؔ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

فسانے یوں تو محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیب داستاں کے لیے

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بد نام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر
یہ اہل مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا

22.3.7 بہادر شاہ ظفرؔ

بہادر شاہ ظفر کا پورا نام سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ تاریخی نام ابوظفر تھا۔ اسی رعایت سے انہوں نے اپنا تخلص ظفرؔ اختیار کیا۔ اورنگ زیب کے ایک فرزند شاہ عالم کا لقب بھی بہادر شاہ تھا لہٰذا یہ بہادر شاہ ظفر ثانی کہلائے جاتے ہیں۔ ان کے والد کا نام اکبر شاہ ثانی تھا جن کی ایک ہندو بیوی لال بائی تھی، انہی کے بطن سے ان کی ولادت ۱۸ شعبان ۱۱۸۹ھ/ ۱۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء کو ہوئی۔ ۱۸۳۷ء میں ان کے والد کے انتقال کے ساتھ ہی وہ تخت نشین ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی کو انگریز سرکار کی طرف سے ماہانہ ایک لاکھ روپیہ وظیفہ ملتا تھا اور ان کا اپنا اندوختہ بھی تھا لہٰذا بہادر شاہ ظفر کا کچھ زمانہ آرام سے گزرا۔ لیکن اخیر عمر میں جب یہ اندوختہ ختم ہوا تو اخراجات کی بھرپائی کے لیے پنشن کم پڑ گئی، جس کے لیے انہوں نے انگریزوں سے اضافے کا مطالبہ کیا، لیکن انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ لہٰذا آخری ایام میں لال قلعے میں عسرت اور تنگدستی کا زمانہ تھا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ معاملاتِ سلطنت روز بروز ان کے ہاتھ سے نکلتے رہے اور دربار کا نظام درہم برہم ہوتا رہا۔ ظفر کی مشکلات میں اضافے کا باعث ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی بنی۔ ان کے تینوں بیٹوں مرزا اسماعیل، ابوبکر اور خضر سلطان کے کٹے ہوئے سر ان کے سامنے طشتری میں پیش کیے گئے۔ ان کو لال قلعہ چھوڑنا پڑا اور ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہو کر آخر کار رنگون میں پیوند خاک ہونا پڑا۔ رنگون میں وہ اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ آخر کار جمعہ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو انہوں نے اپنی جان خالقِ حقیقی کے سپرد کی۔

کتنا ہے بد نصیب ظفرؔ، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ان کا کلام وارداتِ قلبی کا آئینہ دار ہے۔ ایک عظیم تہذیب کے خاتمے کا واقعہ ان کی ذات سے منسلک ہے۔ ان کی شعری تخلیقات ایک ضخیم کلیات پر پھیلی ہوئی ہے، جس میں بیس ہزار کے قریب اشعار موجود ہیں۔ انہوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے، مخمس، مسدس، قصائد، غزل، سہرا، دوہے، ٹھمری، گیت، قطعات وغیرہ وغیرہ، لیکن غزل ان کی مرغوب صنف تھی۔ ان کی غزل میں وہ تمام خصوصیات اور موضوعات مل جاتے ہیں جو اس دور میں حاوی تھے۔ لیکن زیادہ تر اس میں ان کی ذاتی المنا کی اور محرومیوں کا بیان ہے۔ ان کی ذات صرف اپنی ذات نہ تھی بلکہ ایک شہنشاہ کی حیثیت سے ہندوستانیوں کا کلی وجود تھا جو اب انگریزوں کے دستِ نگر تھا۔ لہٰذا ان کی اس ذات کی بے بسی سب کی بے بسی تھی، جسے انہوں نے دلگداز انداز میں اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ افسردگی، مایوسی، حزن کی لے ان کے کلام کی اوپری سطح سے ہی واضح طور پر جھلکتی ہے۔ نمونہ کے طور پر درج ذیل اشعار دیکھیے:

تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں
ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دل داغ دار میں

اے وائے انقلابِ زمانے کے جور سے
دلی ظفؔر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالم نا پائیدار میں

یہ قصہ وہ نہیں تم جس کو قصہ خواں سے سنو
مرے فسانہ غم کو مری زباں سے سنو

22.3.8 ماحصل

عزیز طلبا! اس اکائی میں ہم نے غالب کے نمائندہ اور اہم معاصرین کے بارے میں پڑھا۔ کچھ معاصرین کے صرف ناموں کو گنانے پر اکتفا کیا گیا اور چند اہم معاصرین کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی گئی۔ جن میں ذوق، مومن، ظفر، شیفتہ، تفتہ، صہبائی، آزردہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہمیں عہدِ غالب کو سمجھنے کا موقع ملا۔ جہاں تک ذوق کی بات ہے تو وہ غالب کے اہم معاصر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ذوق غزل میں زیادہ کمال حاصل نہ کر سکے، لیکن قصیدہ میں سودا کے بعد انہی کا نام لیا جاتا ہے۔ آزردہ کو سہلِ ممتنع کے بنیاد گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے غالب کو خوش گفتاری، سادگی، سلاست اور روانی کی راہ دکھلائی۔ غالب کے کچھ فارسی خطوط آرزدہ کے نام ہیں اور اکتالیس اشعار کا ایک فارسی قصیدہ بھی انہوں نے ان کے نام لکھا ہے۔ غالب کے معاصرین میں صہبائی کا نام بھی اہم ہے۔ دونوں میں علمی معاملات میں نوک جھونک بھی رہتی تھی۔ صہبائی، غالب کو ایرانیوں کے برابر سمجھتے رہے۔ اور شاعری کے معاملے میں غالب، صہبائی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے تھے۔ مرزا ہر گوپال تفتہ کو غالب بہت ہی عزیز رکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے سب سے زیاہ خطوط تفتہ کے نام ہی بھیجے ہیں۔ ان میں زیادہ تر خطوط شعری اصلاحات سے متعلق ہیں۔ ان میں تنبیہ، مشورہ، پیار و محبت غرض ہر طرح کی اصلاحات شامل ہیں۔ مومن بھی غالب کے معاصرین میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مومن کی غزل میں تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرتِ

اسلوب، مکر شاعرانہ جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ان کی غزل کے مضامین حسن وعشق کے معاملات کے گرد گھومتے ہیں۔ معاملہ بندی بھی مومن کی غزل کی بڑی خصوصیات میں شمار کی جاتی ہے۔ اس دور میں شیفتہ کا بھی ایک خاص مقام تھا۔ انھوں نے مومن خان مومن سے شاعری کی اصلاح لی۔ انہوں نے سولہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ ان کا فارسی کلام حمد، تصوف، حکمت، اخلاق اور محبت کے مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ ان کے اردو کلام میں گرمی اور لذت کے علاوہ شکوہِ الفاظ اور چستی ترکیب بھی پائی جاتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر بھی غالب کے ایک اہم معاصر اور شاگرد تھے۔ ان کا کلام وارداتِ قلبی کا آئینہ دار ہے۔ ان کے یہاں زیادہ تر ذاتی المناکی اور محرومیوں کا بیان ہے۔ انہوں نے دلگداز انداز میں اپنی شاعری کو منظر عام کیا۔

22.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- غالبؔ کے نمائندہ معاصرین کے متعلق واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کے نمائندہ معاصرین کے شعری موضوعات اور نمونۂ کلام کی جانکاری حاصل کی۔
- غالبؔ کے معاصرین کے شعری رجحانات اور ترجیحات سے روشناسی حاصل کی۔
- غالبؔ کے اپنے معاصرین سے تعلقات اور چشمکوں کو جاننے کی کوشش کی۔
- غالبؔ کے معاصرین کے ادبی مقام ومرتبہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔

22.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ غالبؔ کے پانچ معاصرین کا نام لکھیے۔

۲۔ ذوقؔ کی شاعری کی کچھ اہم خوبیاں بیان کیجیے۔

۳۔ ظفرؔ نے کس طرح کی شاعری لکھی ہے؟ واضح کیجیے۔

۴۔ مومنؔ کی شاعری کے امتیازات تحریر کیجیے۔

۵۔ نوابؔ مصطفیٰ خان شیفتہ کے حالاتِ زندگی کو مختصراً بیان کیجیے۔

22.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ غالبؔ کے معاصرین شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، مومن خان مومنؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، مرزا ہر گوپال تفتہؔ، مصطفیٰ خان شیفتہؔ وغیرہ ہیں۔

۲۔ ذوقؔ دہلوی کی غزلوں میں فکر کی آمیزش ہے۔ کلام میں بے ساختگی اور ثقالت بے انتہا ہے۔ اندازِ بیان

سادہ ہے۔ سپاٹ ہے۔ لفظوں کو جوڑ کر شعر بنانے کی کوشش ملتی ہے۔ دراصل ذوقؔ دہلوی قصائد کے شاہ سوار ہیں۔ سودا کے بعد قصیدہ نگاری میں ان ہی کا اعلیٰ مقام ہے۔ ذوق کے قصیدوں میں قصیدے کی تمام شعریات کی پاس داری ملتی ہے۔ زبان دانی کی دھاک ملتی ہے۔ مبالغہ، پرشکوہ الفاظ، شکوہ بیانی، معنی خیزی، منطق و فلسفہ، غیر معمولی اصطلاحات، دعا و طلب کے ہنر، گریز کے کمال، مدح کے جوہر، نادر تشبیہیں وغیرہ ان کے قصائد کے امتیازات ہیں۔

۳۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی شعری تخلیقات ایک ضخیم کلیات پر پھیلی ہوئی ہے جس میں بیس ہزار کے قریب اشعار موجود ہیں۔ انھوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے جن میں مخمس، مسدس، قصائد، غزل، سہرا، دوہے، ٹھمری، گیت، قطعات وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ لیکن غزل ان کی مرغوب صنف ہے۔ ان کی غزل گوئی ان کے دور کی ترجمان ہے۔ ان کا کلام وارداتِ قلبی کا آئینہ دار ہے۔ ان کے یہاں زیادہ تر ذاتی المناکیوں اور محرومیوں کا بیان ہے۔ بے بسی اور بے کسی ان کے کلام کا بنیادی خاصہ ہے۔ کلام میں دلگدازی، افسردگی، مایوسی، حزن کی لے اوپری سطح سے ہی واضح طور پر نظر آتی ہے۔

۴۔ مومنؔ کی شاعری کے مضامین حسن و عشق کے معاملات کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اس میں نسوانی پیکر کو پیش کیا ہے، جس کا ذکر ان کی غزل میں 'پردہ نشین' کے عنوان سے ملتا ہے۔ معاملہ بندی بھی مومن کی غزل کی بڑی خصوصیت میں شمار کی جاتی ہے۔ حسینوں سے چھیڑ چھاڑ، رقیب سے اپنے رویے کا اظہار، وصل و ہجر کی داستان معاملہ بندی کے پیرایہ میں ملتی ہے۔ اسی طرح نازک خیالی مومن کی غزلوں کی اہم خصوصیت ہے۔ انھوں نے اس نازک خیالی میں ندرتِ اسلوب اور شاعرانہ شوخی کو استعمال کیا ہے۔ مکرِ شاعرانہ کے لیے مومن ہمیشہ یاد کیے جاتے ہیں۔ اس صنعت کو انھوں نے خوبی سے برتا ہے۔ انھوں نے تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع کو بھی بہت خوبی سے نبھایا ہے۔

۵۔ نام نواب محمد مصطفیٰ خان اور تخلص شیفتہؔ تھا۔ ان کی پیدائش ۱۸۰۶ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام نواب مرتضیٰ خاں تھا، جن کو بہادر مظفر جنگ کا خطاب ملا تھا۔ انھوں نے رواجِ زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر لی۔ میاں جی مالا مال سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا حاجی محمد نور دہلوی نقشبندی سے فنِ حدیث و تجوید میں استفادہ کیا۔ حج کے دوران شیخ عبداللہ سراج حنفی سے مکہ معظّمہ میں صحاح کے ابتدائی حصے تبرکاً پڑھے اور شیخ محمد عابد سندھی سے بھی استفادہ کیا اور روایت کرنے کی اجازت ملی۔ ان کے علاوہ شاہ غلام علی دہلوی کے خلیفہ مولوی کرم اللہ سے کچھ علوم پڑھے۔ وہ فرائض کے علاوہ نوافل کی پابندی بھی کرتے تھے اور تہجد کا خاص طور پر اہتمام کرتے تھے۔ ان کا شمار دہلی کے روسا اور جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے تعلقہ داروں میں ہوتا تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران ٹھاکروں نے ان کے قلعہ جہانگیر آباد پر قبضہ کیا اور ان کے محلوں کو آگ لگائی۔ گھر کا ساز و سامان جلنے کے ساتھ ساتھ ان کا

کتب خانہ بھی جل گیا، جس میں ان کی اپنی تصانیف اور اردو فارسی کلام بھی آگ کی نذر ہو گیا۔

22.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
اسالیب	:	اسلوب کی جمع، انداز، طرز
مہمل	:	وہ بات یا کلام جس کا کوئی معنی نہ ہو
ثقیل	:	بھاری، بوجھل
دھاک بٹھانا	:	کسی پر اپنا تاثر یا رعب چھوڑنا
المناکی	:	دردناکی، مصائب، مشکلات
دستِ نگر	:	بے بسی، محتاجگی
خوب رو	:	خوبصورت، معشوق
مبصر	:	بصارت رکھنے والا، جانچ پڑتال کرنے والا
پشیماں	:	شرمندہ، پچھتانے والا
ہیچ	:	بے وقعت، گھٹیا، کمتر
پدر	:	باپ
پسر	:	بیٹا، اولاد
پارسا	:	پاک دامن، پرہیزگار
تغیر	:	موقوف، برخاست، تبدیلی
دیار	:	دنیا، ملک، علاقہ، ملک
ناپائیدار	:	غیر مضبوط، بے ثباتی

22.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	تاریخ ادب اردو	:	جمیل جالبی
۲۔	مفتی صدرالدین آزردہ	:	عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی
۳۔	بہادر شاہ ظفر	:	اسلم پرویز
۴۔	امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات	:	محمد ذاکر حسین
۵۔	خاقانی ہند ذوق دہلوی - معتبر کوائف اور مستند کلام	:	کالی داس گپتا رضا
۶۔	مومن خان مومن	:	ظہیر احمد صدیقی